

عرفانِ غالب

سلطان صدیقی

عرفانِ غالب

○

سلطان صدیقی

الحمرا اکیڈمی

پوسٹ بکس نمبر ۶۹۷
ایبک روڈ۔ انارکلی۔ لاہور

الحمرا اکیڈمی

ادارہ ——— الحمرا اکیڈمی (رجسٹرڈ) ایبک روڈ لاہور

طابع ——— کاروان پریس لاہور

کتبہ ——— لطیف

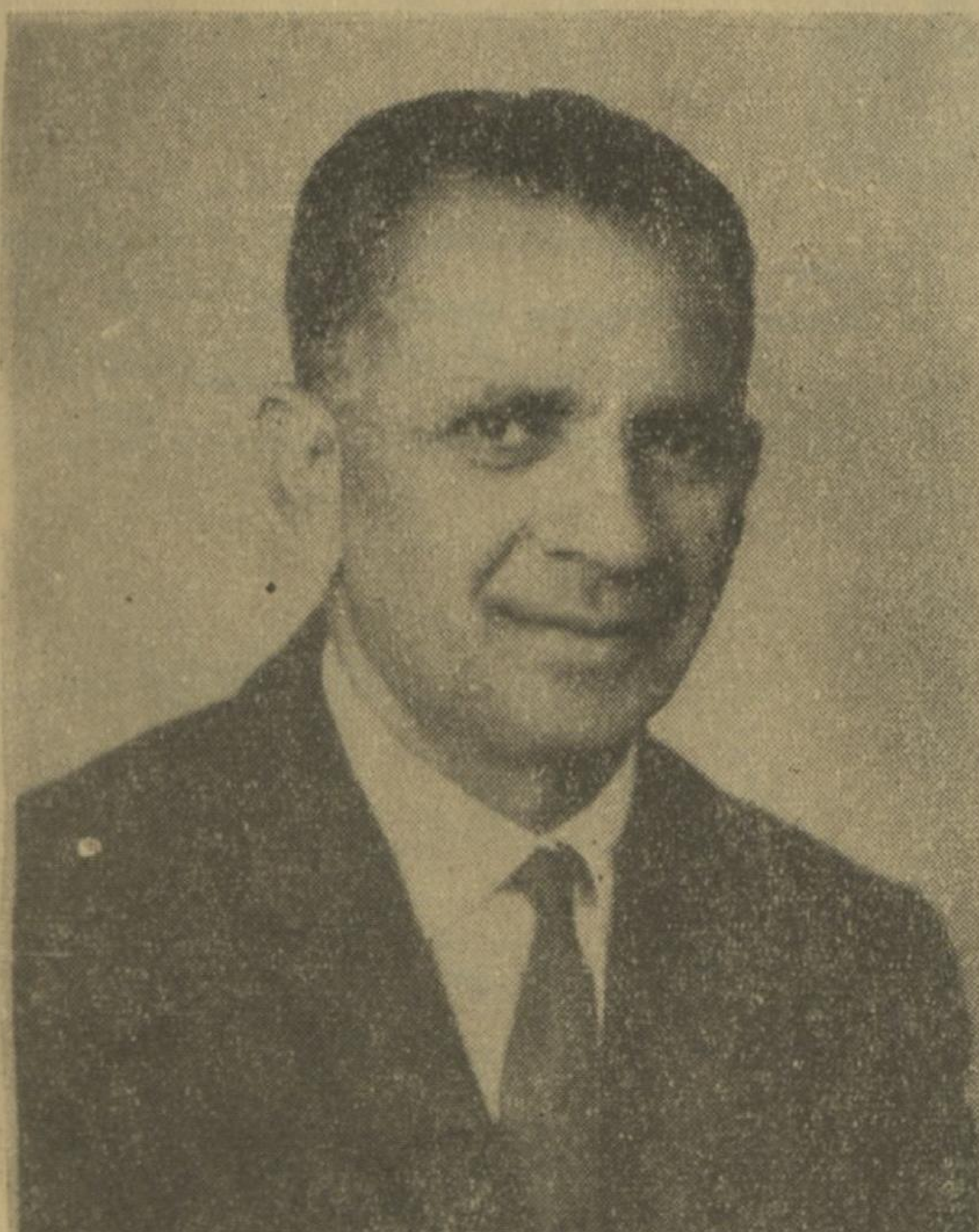
تعداد ——— پانچسو

بار اول ——— جنوری ۱۹۷۴ء

سلسلۂ مطبوعات
(۲۱)

قیمت
۱۲/۰۰
روپے

آئینہ ترتیب

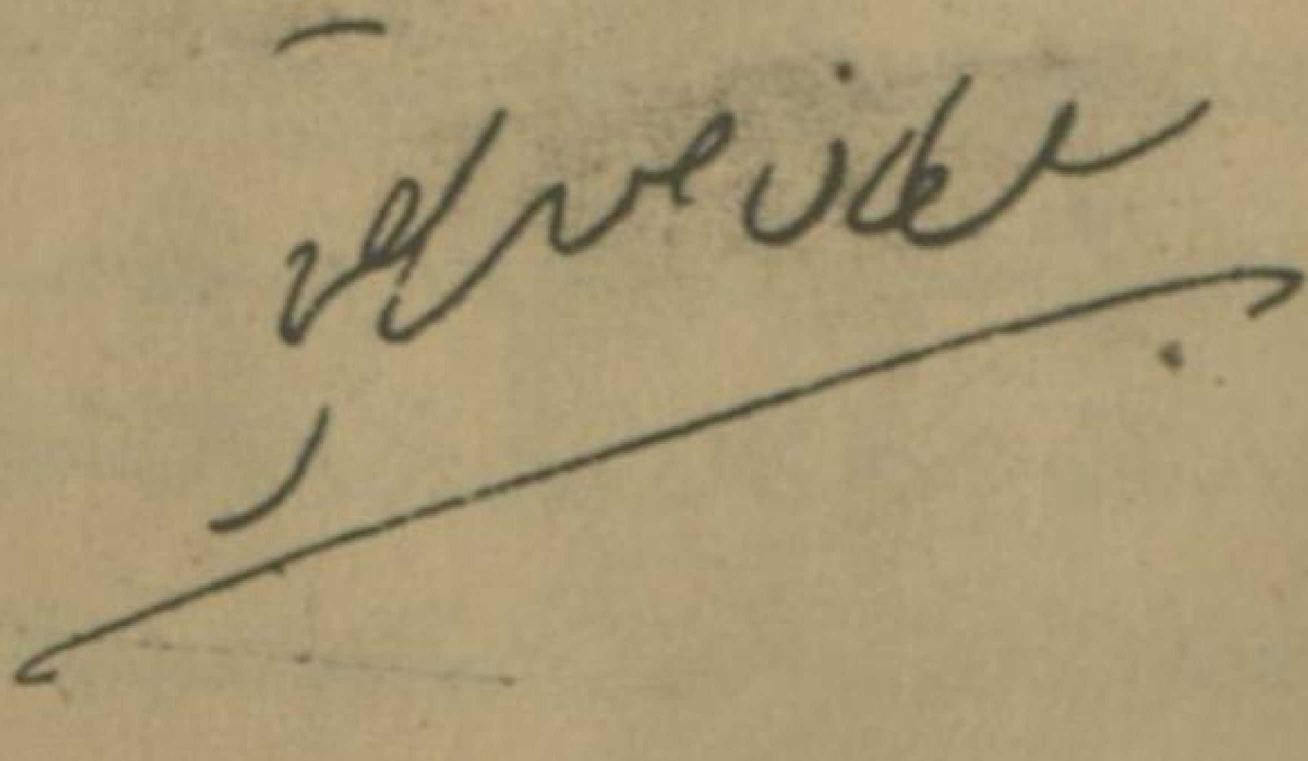


سُلطان صدیقی

انتساب

اپنی رفیقۂ حیات سعیدہ خاتون مرحومہ کے نام !

جو مضامین کی تحریر سے لے کر کتابت کی تکمیل تک قدم قدم پر میری معاون و مددگار بنی رہی اور جب یہ کتاب طباعت کے مراحل میں داخل ہوئی تو اچانک دائمی مفارقت کا داغ دے کر اس جہان سے رخصت ہو گئی ——— لیکن اس کی ہمدردیوں کی بُو باس کا رجاؤ اس کتاب کے ایک ایک نقطہ میں موجود ہے



قطرہ کو گہر ہونے تک

"الحمرا اکیڈمی" کا قیام ۱۹۵۹ء میں عمل میں آیا اور یہ وہ سال ہے۔ جبکہ "غالب" کی صد سالہ برسی کی دھوم دھام تھی۔ اسلئے فطری طور پر اپنے اشاعتی ادارے کے قیام ہی سے یہ خواہش رہی کہ "غالب" پر ایک جامع کتاب شائع کی جائے۔

گو غالب پر بہت کچھ لکھا گیا اور بہت کچھ لکھا جاتا رہے گا۔ کبھی غالب کے کلام کو الہامی کتب کے بعد درجہ عطا کیا گیا۔ اور کبھی صرف خواص کا شاعر قرار دے کر محدود کر دیا گیا۔ لیکن ہماری یہ خواہش تھی کہ غالب پر ایک ایسی جامع کتاب شائع کی جائے جو افراط و تفریط کے درمیان راہ ہو آخر سلطان صدیقی صاحب کا مسودہ برائے اشاعت حاصل کیا گیا جس میں انہوں نے استدلالی طرز تحریر سے غالب کی قدر و منزلت پر بڑے پُر اثر اور واضح انداز سے متعین کی ہے۔ اور غالب کی ہفت پہلو شخصیت پر روشنی ڈالی ہے۔

سلطان صدیقی صاحب نے غالب کے سماجی شعور کی آگہی کے ساتھ ساتھ اس کے انسان ہونے کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ اور بتایا ہے کہ غالب ایک ایسا انسان تھا جس کا مذہب انسانی ہمدردی تھا۔ اور اس کا یہ شخصی پیکر اس کے نثر و نظم سے واضح طور پر ہمارے تہذیبی سنگم پر پورا اترتا ہے۔ گو سلطان صدیقی صاحب کے اس شہ پارے کو ایک عرصہ سے اشاعت پذیر ہو جانا چاہیئے تھا۔ لیکن اس قطرہ کو گہر ہونے تک موجِ صد کام نہنگ سے گزرنا پڑا۔ وطن کے عمومی حالات، کاغذ کی گرانی وغیرہ سنگ راہ بنیں اس دوران بہت سے روڑے کے چھوٹے اور کچھ چھوٹ کر رہ گئے۔ تاہم آج جب یہ کتاب آپکے ہاتھوں میں ہے "غالب" کی چھ برسی ہونے کو آئی۔ ہم اس کتاب کی اشاعت میں اپنے محترم دوست طاہر تونسوی کا بےحد ممنون ہیں جنہوں نے مسودہ حاصل کرنے سے آخری منزل تک ہم سے تعاون کیا۔

ہم محترم پروفیسر پرکاش صدیقی صاحب کا ممنون ہیں جنہوں نے کتاب کا مقدمہ لکھکر کتاب کی منزلت میں اضافہ کیا ہے۔ موضوع سے انصاف اور کتاب کے رکھ رکھاؤ کے سلسلے میں ہمارے قارئین ہی کوئی فیصلہ صادر کر سکتے ہیں۔ لطیف صاحب کا شکریہ ادا نہ کرنا ناسپاس گزاری ہے کیونکہ انہوں نے اپنی پیشہ ورانہ ذمہ داریوں کے علاوہ بھی کتاب کی حسن و تزئین میں دلچسپی لی۔

سید معراج نیر

گذارشِ احوال

یہ عین ممکن ہے انسان کے دل میں ہزاروں ایسی خواہشیں پیدا نہ ہوتی ہوں کہ ہر خواہش پہ دم نکلتا محسوس ہو۔ تاہم کچھ خواہشیں ایسی ضرور ہوتی ہیں اور جب ان میں سے بھی ہر خواہش، خواہش ہی رہ جاتی ہے اور ہر تمنّا۔ تمنّا ــــــ تو انسان کا دل بھی متاثر ہوتا ہے اور دماغ بھی ــ اس کی ذہنی فضا اکثر رنج و مایوسی کے اندھیاروں سے کجلا جاتی ہے یہ مہیب اندھیارے کب تک ذہن انسانی پر سائے ڈالے رہتے ہیں اور کب کوئی کرن ایسی پھوٹتی ہے جو ان مہیب اندھیاروں کو یکسر ختم کردے اس کا انحصار ہر شخص کے اپنے احساس اور عزم و حوصلہ پر منحصر ہوتا ہے ساتھ ہی وقت کی معجز نمائیاں بھی مسلسل مصروفِ عمل رہتی ہیں جو انسان کے بڑے سے بڑے زخم اور گہرے سے گہرے گھاؤ کو ہر لحظہ اور ہر آن مندمل کرتی چلی جاتی ہیں اور کچھ عرصہ بعد انسان ایسا محسوس کرنے لگ جاتا ہے جیسے پہلے کچھ ہوا ہی نہ تھا۔

سال ۱۹۴۸ء میں جب میں نے علیگڑھ کو خیر آباد کہا اور اس وقت کے اپنے گھر (بھوپال) روانہ ہونے لگا تو اردو کی خدمت کرنا میری سب سے بڑی خواہش تھی اور اس خواہش کی تکمیل کے لئے میں پڑھنے پڑھانے کے پیشے کو اپنے لئے سب سے زیادہ مناسب و موزوں سمجھتا تھا۔ اسے حسنِ اتفاق کہئے یا محض اتفاق کہ اس وقت حمیدیہ کالج بھوپال میں ایک آسامی اردو لیکچرار کی بھی خالی ہوگئی جسے میں نے تائید غیبی سمجھا اور بڑی امیدوں اور آرزوؤں کے ساتھ اس جگہ کے لئے درخواست دے دی اسی زمانے میں جان نثار اختر بھی اسی جگہ کی خاطر گوالیار سے بھوپال پہنچ گئے درخواستیں تو اس آسامی کیلئے کئی اور بھی تھیں مگر اصل مقابلہ میرا اور جان نثار اختر ہی کا تھا علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم بھی اس زمانے میں وہاں قاضی شہر تھے جنہیں خصوصی طور پر

ممبران پبلک سروس کمیشن نے امیدواروں سے سوالات کرنے اور جوابات سننے کے لئے مدعو کر لیا تھا۔ بہر حال انٹرویو ہوا اور نتیجہ بھی وہی برآمد ہوا جس کا پہلے ہی مجھے گمان پیدا ہو گیا تھا یعنی جان نثار اختر کالج میں اور میں چند یوم بعد سیاہ کوٹ پہن کر عدالت العالیہ میں ـــــ چند یوم بعد اس لئے کہ مجھے اس کی تو کوئی شکایت نہ تھی کہ جاں نثار اختر کا چناؤ غلط ہوا تھا کیونکہ میں ان کی ادبی خدمات اور علمی برتری کا پہلے ہی سے قائل تھا مگر اپنے سپنے کے ٹوٹنے اور خواب کے بکھر جانے کا شدید احساس تھا اس احساس کا طبیعت پر یہ اثر ہوا کہ وہ آرزو جو اردو کی خدمت کی ذہن میں موجود تھی ایک حد تک افسردہ ہو گئی اور میں اپنی نئی زندگی کے تقاضوں اور معاشی مطالبوں کی تکمیل کیلئے سرگرم عمل ہو گیا۔

قیام پاکستان کے بعد سے ہندوستان میں مسلمانوں کو اپنا مستقبل، فرقہ وارانہ فسادات کی وجہ سے بڑا ڈانواں ڈول اور متزلزل نظر آرہا تھا جس کا اثر بھوپال کے مسلمانوں کی زندگیوں پر بھی پڑنا شروع ہو گیا تھا لیکن نواب حمید اللہ خان اپنی مقدور بھر کوششوں سے اس سیاسی سیلاب کو روکے ہوئے تھے جو ریاستوں کے وجود کو تیزی سے ختم کرتا جا رہا تھا مگر ۱۹۴۹ء کے آخر میں یہ ریاست بھی نواب حمید اللہ خاں کی بسیار دور اندیشیوں اور ہزاروں مصلحتوں کے باوجود بھارت سرکار میں مدغم ہو گئی اور وہاں کی وہ پرسکون زندگی تیزی سے بدلنا شروع ہو گئی۔ جس میں ہندو مسلم سالہا سال سے بھائی بھائی کی طرح امن و آشتی سے رہتے چلے آرہے تھے چنانچہ ان بدلتے ہوئے سیاسی حالات کے پیش نظر میں نے خود کو وہاں کے حالات کے سپرد کر دینا مناسب نہ سمجھا اور ۱۹۵۱ء میں ترک سکونت کرکے کراچی چلا آیا۔ نقل مکانی کے بعد بھی میری دلی خواہش یہی تھی کہ مجھے کہیں اردو کی خدمت کا موقع مل سکے مگر اس وقت بھی مجھے اپنے مقصد میں خاطر خواہ کامیابی ہوتی نظر نہ آئی دوسرے یہ کہ کراچی کی زندگی (کراچی کے رہنے والوں سے معذرت کے ساتھ) مجھے کبھی پسند نہ آئی اور اس کی سب سے بڑی وجہ میرے نزدیک وہ "کاروباریت" ہے جو وہاں کی زندگی میں رچ بس گئی ہے جس کا ایک دوسرے سے علیحدہ کرنا یا اس کے متعلق اب کچھ سوچنا ممکن ہی نہیں ـــــ ایسی زندگی کے اثرات

انسانی اخلاق پر کیا پڑتے ہیں اور وہ کیا کچھ بن جاتا ہے اس سے قطع نظر میں کراچی سے چند یوم کی تگ و دو کے بعد ملتان چلا آیا جہاں میرے ٹھہرنے کا ایک سہارا موجود تھا اُس وقت کے سہاروں کی قدر و قیمت کچھ بے سہارے ہی خوب جانتے تھے۔ ویسے سہاروں کی ضرورت انسان کو ہر آن اور ہر لحظہ ہی رہتی ہے یہ ممکن ہے کہ اُن کے انداز اور طریقے بدلے ہوئے ہوں۔ بہرحال ملتان کا جائزہ تلاش معاش کی خاطر لیا تو یہاں بھی اس وقت ایمرسن کالج میں ایک آسامی اردو لیکچرار کی خالی تھی جس کے لئے میں ڈائرکٹر تعلیمات لاہور سے ملا لیکن انہوں نے یہ کہہ کر جائے خالی پر تقرّر کرنے سے انکار کر دیا کہ ان کے پاس پہلے سے بہت سی درخواستیں اس جگہ کے لئے موجود ہیں۔ اس بار بھی میری دیرینہ خواہش سسک اور کراہ کر دم توڑ گئی اور میں نے اپنے دل کو یہی کہہ کر تسکین دے لی کہ شاید میرا خالق اب بھی مجھے اس راہ گزر سے دور ہی رکھنا چاہتا ہے اور اس کا مسافر بننا میرے لئے مناسب نہیں سمجھتا۔ چنانچہ بادل نخواستہ پھر میں نے عدالت العالیہ لاہور سے وکالت کی اجازت حاصل کر لی اور ملتان میں پریکٹس شروع کر دی۔ اور تادم تحریر یہی میری حیثیت قائم و برقرار ہے جس کا شعر و ادب سے دور کا بھی تعلق نہیں ہوتا۔

اب سے تقریباً پانچ سال قبل چند با ادب حضرات نے ایک ادبی انجمن کی طرح ڈالی جس کا نام "اردو اکیڈمی" رکھا گیا اور اس انجمن میں مجھے بھی نہ صرف حاضر ہونے بلکہ کچھ لکھنے کیلئے پابند کیا گیا یہ پابندی کیونکہ بڑے مخلصانہ انداز میں پاکیزہ مقصد کیلئے عائد کی گئی تھی۔ اس لئے مجھے راہ فرار کی کوئی صورت نظر نہ آئی۔ اب لکھنے کیلئے میں نے اپنا جائزہ لیا تو اردو سے لگن اور لگاؤ کا نہ وہ شدید جذبہ ہی دل میں موجود تھا جو کبھی میں محسوس کیا کرتا تھا اور نہ مزاج میں تازگی و شادابی ـــ ادھر اپنی کم مائیگی اور کم علمی کا بھی شدید احساس تھا۔ کیونکہ بیس اکیس برس کے طویل عرصہ میں اردو شعر و ادب کا کارواں نہ صرف بہت آگے نکل چکا تھا بلکہ کئی نئی راہیں اور کئی جہتیں اپنے لئے متعین کر چکا تھا۔ اور ایسے دل آویز مظاہرے اور کامیاب تجربے ہو چکے تھے جنہوں نے نہ صرف اردو کو نئی رفعتوں سے ہمکنار کر دیا بلکہ اس کے مزاج میں ایک نیا شعور نیا سلیقہ اور نیا انداز پیدا ہو گیا تھا اور میری نظر میں اب بھی اردو ادب کے وہی

پچھلے شام وسحر کسی قدر اماناً محفوظ تھے ان حالات میں میرے لئے کچھ لکھنا جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا۔ لیکن ایک ڈیڑھ سال تک اردو اکیڈمی کے اجلاسوں کی شرکت اور اپنی مشغولیت سے فرصت کے جو لمحے وقتاً فوقتاً میسر آسکے۔ ان میں کچھ پڑھنے پڑھانے سے میں نے اپنے ذہن کے افق پر کچھ دریچے کھلتے محسوس کئے جس سے میرے مزاج کے تاریک گوشوں میں کچھ روشنی بھی پہنچی اور گرمی بھی —— اور یہ اسی روشنی اور گرمی کا نتیجہ ہے کہ ڈیڑھ سال کے عرصہ میں جو کچھ میں نے لکھا ہے وہ "عرفانِ غالب" کی شکل میں آپ کے روبرو پیش ہے۔

یہاں یہ عرض کر دینا بھی مناسب سمجھتا ہوں کہ غالبؔ کے شعر وادب سے مجھے خاصی دلچسپی رہی ہے اور اس کے کلام نے اکثر جہاں میرے تسکین ذوق کا سامان مہیا کیا ہے وہاں مجھے بے حد متاثر بھی کیا ہے۔ اور اس میں شک بھی نہیں کہ غالب ہی ایک ایسا شاعر اور ادیب ہے جو اردو نظم ونثر دونوں میں ایک ہی شان سے صف اوّل میں جلوہ گر نظر آتا ہے۔ ادھر غالب کی صد سالہ برسی کا شہرہ بھی کافی دن سے ہندوپاک میں سنا جا رہا تھا اس لئے میں نے غالبؔ پر ہی کچھ لکھنا مناسب خیال کیا اور اس کی فکروفن پر مختلف موضوعات کے تحت اپنے خیالات کا اظہار وقت کی آواز سمجھا۔ یہ ضرور ہے کہ غالب کی شخصیت اور فکروفن پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ اب قلم اٹھانے کی کوئی گنجائش نہیں —— غالب کی شخصیت اور فن میں جہاں غضب کی انفرادیت موجود ہے وہاں بے پناہ رنگا رنگی بھی موجود ہے اور اس نے اپنی مخصوص صلاحیت سے وقتی رجحانات کو پسِ پشت ڈال کر زندگی اور فن کے انتہائی بلند وبالا مقصد کو پیش نظر رکھا ہے اس لئے اس کے فن شعر وادب کی ہزاروں توضیحات اور تصریحات ہو جانے کے باوجود آج بھی ہر صاحب نظر اس کے کلام میں نئے پہلو اور نئی جہتیں تلاش کر لیتا ہے اس کے علاوہ غالب کی ایک خوبی یہ بھی ہے جو دوسرے شعرا میں کم ہی نظر آتی ہے کہ جب بھی اسے جداگانہ زاویہ نگاہ سے دیکھا جائے وہ ہمارے سامنے نئی آن بان اور نئے انداز سے آموجود ہوتا ہے۔ اور اس کے کلام سے قاری کا ذہن کبھی تھکا دینے والی اکتاہٹ محسوس نہیں کرتا بلکہ ایک "لذت" محسوس کرتا ہے جس کے متعلق خود غالب نے کہا ہے ؎

دیکھنا تقریر کی لذّت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

غالبؔ کو میں نے اپنی نظر سے دیکھنے اور اپنی بساط بھر سمجھنے کی کوشش کی ہے اور اس التزام کو پیش نظر رکھا ہے کہ مضامین میں یکساں خیالات اور واقعات کا اعادہ نہ ہو پائے مگر موضوعات کی پابندی سے ممکن ہے کہیں خیالات کی حدود ایک دوسرے کو چھوتے نظر آئیں لیکن طرزِ اظہار اور اندازِ بیان یقیناً بدلا ہوا نظر آئے گا۔

عرفانِ غالبؔ' میں جو مضامین شامل کئے گئے ہیں ان میں سے بیشتر یہاں کے ادبی رسائل میں شائع ہو چکے ہیں لیکن اب کچھ ترمیم و تنسیخ اور اضافہ کے بعد انہیں کتابی صورت میں اس لئے پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہوں کہ آپ یکجا طور پر غالبؔ کو میری نظر سے بھی دیکھ سکیں۔

گذارشِ احوال کی طوالت ممکن ہے آپ کے ذہن پر گراں گزری ہو لیکن اس سے میرا مقصد آپ کو پریشان کرنا ہرگز نہیں بلکہ اپنے حالات اور محسوسات کا اظہار اس لئے مناسب سمجھا کہ اس پس منظر میں آپ میری اس کتاب کے متعلق بآسانی کوئی رائے قائم فرما سکیں۔ یہاں یہ عرض کر دینا بھی مناسب سمجھتا ہوں کہ میں نے خود کو نہ کبھی ادیب سمجھا ہے نہ انشا پرداز، نہ محقق، نہ ناقد اور نہ کبھی کسی ادبی تحریک سے خود کو وابستہ کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ میں نے جو کچھ لکھا ہے صرف اردو ادب کے ایک ادنےٰ طالب علم کی حیثیت سے لکھا ہے اور اس کتاب کو پیش کرتے ہوئے جہاں مجھے قدم قدم پر اپنی کم علمی اور بے بضاعتی کا اعتراف ہے وہاں اپنی اس حیثیت پر کسی قدر ناز بھی ہے اور وہ اس لئے کہ بہت ممکن ہے کل یہی حیثیت میرے بکھرے ہوئے خواب کی شیرازہ بندی کر سکے۔

'عرفانِ غالب' کے مضامین کو کتابی شکل میں ترتیب دے لینے کے بعد میں نے مناسب سمجھا کہ اس کے پیش لفظ کے لئے اپنے محترم اور شفیق کرم فرما جناب مولانا غلام رسول صاحب مہرؔ کو زحمتِ نگارش دوں۔ میری درخواست پر مولانا مہرؔ نے نہ صرف جملہ مضامین کو بڑی توجہ اور کاوش سے پڑھا بلکہ اپنے قیمتی مشوروں سے بھی سرفراز

فرمایا۔ پیش لفظ کی تحریر کے لئے وہ کسی قدر اطمینان و سکون کے منتظر تھے جو خرابی صحت اور عدیم الفرصتی کے باعث میسر نہ آسکا حتیٰ کہ وہ ۱۶ر نومبر ۱۹۷۱ء کو دائمی مفارقت کا غم دے کر اس جہان فانی سے رخصت ہو گئے۔

مولانا مہر نے میری خاطر جو زحمت اٹھائی اور ان کی جو نوازشیں میرے حال پر رہیں ان کا شکریہ ادا کرنا تو آسان بات نہیں لیکن یہاں ان کے ایک ادنیٰ سپاس گزار کی حیثیت سے میں یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ اس کتاب کے سلسلہ میں ان کے متعدد خطوط سے صرف دو کے اقتباسات بطور فریضۂ سپاس پیش کردوں۔

"۲۰/۱/۷۰ باسمہٗ سبحانہٗ

ہیچ می دانی کہ غالب چوں بسر بردم بہ دہر
من کہ طبع بلبل و شغل سمندر داشتم

مکرمی ــــ پارسل مجھے مل گیا ــــ تاہم ابھی تک کوئی بھی مقالہ پڑھنے کی فرصت نہیں مل سکی آج میری کتاب کا حرفِ آغاز مکمل ہو گیا خدا چاہے تو ایک دو روز میں مشغولیت معمول پر آجائے گی۔ انشاء اللہ تعالیٰ اور میں آپ کی نگارشات کے مطالعے سے استفادہ شروع کردوں گا۔ پھر کچھ عرض کر سکوں گا۔

آپ اس عاجز پر جو لطف فرماتے ہیں اس کا شکریہ ادا کرنے کیلئے الفاظ کہاں سے لاؤں ــــ؟ جس روز پارسل ملا تھا اسی روز مجھے الگ رسید بھیج دینی چاہیئے تھی۔ لیکن خدا شاہد ہے کہ افراتفری میں کتاب کی تکمیل کے علاوہ احباب کی تشریف آوری بھی جاری رہی اور میں بالکل بے بس ہو گیا اس کے لئے عفو خواہ ہوں آپ میری حالت دیکھتے تو یقین ہے کہ خود معاف فرمادیتے اور میرے ساتھ ہمدردی فرماتے آپ کو اقبالؒ کی مشہور نظم کا یہ مصرع یاد ہو گا۔

سفینۂ برگِ گل بنالے گا قافلہ مورِ ناتواں کا

میں بھی سمجھتا ہوں کہ میرے مشاغل کی حقیقت ایک بے پناہ سیل کی ہے میں ایک مورِ ناتواں کی حیثیت میں ایک پتے پر بیٹھا ہوا بہا چلا جا رہا ہوں۔ بالکل بے دست و پا ــــ جدھر موجیں لے جاتی ہیں نکل جاتا ہوں ــــ نہ اس آبی سفر

یں سمت و جہت کے تعین کا اختیار اور نہ رک جانے کی قوت ۔ اللہ کی رحمت پر ہر حال میں بھروسہ اور اس کے لطف و کرم کا ہر حال میں شکر گزار ہوں ۔

قطعاً شبہ نہیں کہ میری حالت "قابل رشک" نہیں سمجھی جا سکتی لیکن خدا کی رحمت پر نظر ہے کہ جو بھی مشغلہ سامنے آجاتا ہے اسے پورا کرا ہی دیتا ہے ۔ میری کوشش یہی ہو گی کہ مطالعے سے فارغ ہوتے ہی جو کچھ ممکن ہو لکھ دوں ——— !

عاجز مہر

۷/۱۲/۱۴

باسمہٖ سبحانہٗ

مکرمی ——— غالباً آپ کو میری طویل خاموشی کسی حد تک ناگوار محسوس ہوئی ہو ۔ اس کے لئے عفو خواہ ہوں .... خیر ۔ ایک عاجز خدمت گزار صرف نظرِ لطف کا امیدوار ہے خدا کرے کہ وہ کوئی خدمت عاجزانہ طریق پر انجام دے سکے ۔

میں یہ عرض کرنا چاہتا تھا کہ میں نے آج آپ کے تمام مقالات از اوّل تا آخر پڑھ لئے ہیں اگر تھوڑی سی مزید تاخیر پیش لفظ لکھنے میں ہو جائے تو امید ہے اجازت مرحمت فرما دیں گے ۔ میں انشاء اللہ چند روز میں ملتان آنے والا ہوں ۔ مقالات ساتھ لاؤں گا ۔ اگر میں آپ کی ملاقات سے شرف یاب ہو سکا تو چند گزارشیں پیش کرنا چاہتا ہوں ۔ پھر انشاء اللہ میں وہ تحریر مرتب کر دوں گا جسے پیش لفظ کہا جاتا ہے اگرچہ وہ اس عاجز کی طرف سے آپ کی بارگاہِ علم و فضل میں عقیدت و نیاز کا ایک گلدستہ ہو گا .... " عاجز مہر

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں اپنے مخلص دوست پروفیسر عرش صدیقی صاحب کا شکریہ کس زبان سے ادا کروں جن کا مشورہ اور ہمت افزائی اس کتاب کی تکمیل اور اشاعت میں قدم قدم پر میرے شامل حال رہی اور خود انہوں نے عرفانِ غالبؔ پر پیش لفظ لکھنے کی زحمت میری خاطر گوارا کی ۔

بہر حال میں ان کی پیہم نوازشات اور اس زحمت کا بے حد ممنون ہوں جو انہوں نے میری خاطر برداشت کی ۔

میں طاہر تونسوی صاحب اور سید معراج نیّر صاحب کا بھی احسان مند ہوں جنہوں نے کاغذ اور سامانِ طباعت کی ہوشربا گرانی کے باوجود "عرفان غالب" کی ظاہری آرائش کو متاثر نہ ہونے دیا۔

سلطان صدیقی

ایم اے۔ ایل ایل بی (علیگ)

۳۷ — بی، گل گشت، ملتان

مورخہ ۱۵ر فروری ۱۹۷۳ء

پیش لفظ

پروفیسر عرش صدیقی

غالب پر بہت کچھ لکھا گیا ہے ۔ عرفانِ غالب اس خزانے میں ایک عمدہ اضافہ ہے سلطان صدیقی نے جیسا کہ انہوں نے گذارش احوال میں غالباً انکساری سے کام لیتے ہوئے خود کہا ہے کہ غالب کا مطالعہ ایک طالب علم بن کر کیا ہے ۔ ان کے بعض مقالوں کی طوالت کا سبب ان کا یہی رویہ ہے ۔ اور اسی لئے تفصیل کاری ان کے اسلوب کا اہم ترین پہلو بن گئی ہے ان کے ہاں پھیلاؤ ہے اختصار نہیں ۔ وہ تاثراتی یا تجریدی تنقید کے کبھی قائل نہیں رہے تنقید اشاروں پر انحصار نہیں کرتی تفصیل اور وضاحت کا تقاضہ کرتی ہے ۔ تنقید دریا کو کوزے میں بند نہیں کرتی بلکہ فن کے کوزے میں بند دریا کو باہر نکالتی ہے اور پھر اس دریا کے ساتھ ساتھ سمندر تک جاتی ہے ۔ سلطان صدیقی کا یہی انداز ہے ۔ ان کی تحریر میں خلوص کی خوشبو اور سچائی کی مہک ہے ۔ اس لئے یہ طوالت خوشگوار تاثر چھوڑتی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سلطان صدیقی نثر کے اسلوب میں اشاراتی اور علامتی انداز کو پسند نہیں کرتے ۔ کیونکہ نثر بات کو سمجھنے سمجھانے کی زبان ہے ، دلائل اور ردِ دلائل کا ذریعہ ہے اس لئے اس میں مفصل گفتگو کا ہونا لازمی ہے ۔ ان کی زبان اور اسلوب میں جو کلاسیکی پاکیزگی اور شائستگی نظر آتی ہے اس کا یہی سبب ہے اور غالباً اسی لئے وہ اگر ایک طرف حسن عسکری کے مقلد نہیں ہیں تو دوسری طرف افتخار جالب کے بھی قریب نہیں جاتے ۔

سلطان صدیقی نے اگرچہ غالب کے مطالعے میں نفسیاتی پس منظر کو نظر انداز نہیں کیا تاہم انہوں نے اس پہلو پر اس انداز میں زیادہ زور بھی نہیں دیا جس طرح سلیم اختر یا ان سے پہلے سلیم احمد نے کیا ہے انہوں نے دراصل غالب کا مطالعہ تہذیبی ، سماجی اور سیاسی پس منظر میں کیا ہے اور اس کی نفسیات کو اس کے دور کے ماحول کے تابع یا کم از کم اس سے وابستہ کر کے دیکھا ہے اس پس منظر کو محض انسانی پس منظر بھی کہا جا سکتا ہے ۔ کیونکہ اس مطالعے میں انسان کی تاریخ اور معاشرت کے واضح حوالے بھی موجود ہیں ۔ سلطان صدیقی نے غالب کے بارے میں کوئی بالکل نیا فلسفہ یا نظریہ پیش کرنے کا دعویٰ نہیں کیا ۔ صرف غالب کو پہچاننے کی ایک کوشش کی ہے ۔ اور اس سلسلے میں زیادہ انحصار اپنے مشاہدے اور مطالعے پر ہی کیا ہے ۔ گذارش احوال میں اسی

لئے لکھتے ہیں کہ "غالب کو میں نے اپنی نظر سے دیکھنے اور اپنی بساط بھر سمجھنے کی کوشش کی ہے" اور یوں تاریخی، سماجی، تہذیبی اور کسی حد تک نفسیاتی پس منظر میں بات کرنے کے باوجود ان کا مارکس، یونگ، ایڈلر ہاؤ اور فرائیڈ کے حوالوں سے اجتناب سمجھ میں آتا ہے۔ انہوں نے غالب کا مطالعہ بہر حال صحیح خطوط پر کیا ہے اور جگہ جگہ جدلیات کے حوالے کے بغیر جدلیاتی انداز تنقید بھی اختیار کیا ہے۔ بالخصوص تاریخ اور تہذیب کے پس منظر کا تجزیہ کرتے ہوئے۔

اس کتاب کے مطالعہ سے غالب کی جو شخصیت ابھر کر سامنے آتی ہے اس کی اہم ترین خصوصیت انسان دوستی اور وسیع المشربی ہے۔ میں تو یہ کہہ دینے کی جرأت بھی کروں گا کہ اس کتاب کے تمام مضامین مختلف موضوعات رکھنے کے باوجود غالب کی اسی خصوصیت کو نمایاں کرنے کے لئے لکھے گئے ہیں سلطان صدیقی غالب کے کردار کے اس پہلو سے اتنے متاثر ہیں کہ کم و بیش ہر مضمون میں اس کا ذکر کسی نہ کسی شکل میں آگیا ہے

غالب اور خدا میں خدا کے بارے میں رائج نظریات پر گفتگو کے بعد جو بحث سلطان صاحب نے کی ہے اس سے انہوں نے خود یہ نتیجہ نکالا ہے۔

"غالب کا یہی مسلک کہ نور الٰہی کی تجلیاں کائنات پہ محیط ہیں ــــ وسیع القلبی ــــ اعلیٰ مشربی اور انسان دوستی کا ہمہ گیر جذبہ پیدا کر دیتا ہے ــــ"

سلطان صاحب نے خدا اور مذہب کی بحث سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ فطرت اور خدا وسیع المشرب ہیں اور یہی مسلک تھا غالب کا اور اسی لئے غالب میں ہمدردی اور حق پسندی کی خوبیاں بھی پیدا ہوگئی تھیں۔ سلطان صاحب کا خیال ہے کہ غالب نے تصوف بھی اپنے کردار کی اسی خصوصیت کی بنا پر اختیار کیا تھا۔ تصوف میں جو انسان دوستی کا ایک جذبہ کار فرما ہے غالب اس سے متاثر ہوا تھا۔

بقول ڈاکٹر خورشید الاسلام " ان کا تصوف تزکیہ نفس یا دوسروں کی تلقین کے لئے کم اور اپنے تحفظ کے لئے زیادہ ہے ــــ"

سلطان صدیقی نے غالب کے تصوف کا سماجی اور نفسیاتی پس منظر تلاش کیا ہے

ان کا خیال ہے کہ سیاسی افراتفری میں غالب کو بھی کسی جائے پناہ کی تلاش تھی اور تصوف نے اس کی یہ ضرورت پوری کر دی ان کے بقول "غالب نہ ولی تھے اور نہ تصوف کو انہوں نے دل سے قبول کیا تھا ــــــ" ان کا یہ بھی خیال ہے کہ " غالب نے تصوف کو ایسے پُر اثر اور رنگین انداز میں پیش کیا ہے کہ یہ روح عصر ان کی داستان حیات کا سب سے زیادہ روشن باب نظر آتی ہے ــــــ" ان الفاظ سے صاف ظاہر ہے کہ خود سلطان صدیقی بھی تصوف کو عصر کے حوالے سے پہچانتے ہیں۔

غالب کی انسان دوستی اور وسیع المشربی سلطان صدیقی کے نزدیک غالب کے کردار اور کلام کی روح متعین کر دیتی ہے اسی لئے اس خوبی کا ذکر بار بار آیا ہے غالب کے سماجی شعور پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

" غالب کے مزاج میں انسان دوستی اور حقیقت پسندی کی وہ اعلےٰ صفات بھی موجود تھیں جو انہیں اپنے معاشرے اور فرد کے قریب تر لانے کا بڑی حد تک سبب بنیں ــــ وہ جس میں بھی جوہرِ قابل پاتے قدر کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ان کی دوستی مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ہندوؤں اور انگریزوں سے بھی تھی وہ اپنی طبیعت کے متعلق خود کہتے ہیں ــــــ کہ " میں تو بنی آدم کو مسلمان ہو یا ہندو یا نصرانی ــــــ عزیز رکھتا ہوں اور اپنا بھائی جانتا ہوں ــــــ"

" غالب خستہ کے بغیر" کا موضوع غالب کا احساسِ غم ہے اس مضمون میں منجملہ دوسری بحثوں کے سلطان صدیقی نے یہ بھی کہا ہے۔ کہ غالب کی غزل اور اسی حوالے سے اس کا احساسِ غم بھی انسان دوستی کے جذبے کے مظہر ہیں۔ ان کی اس رائے سے اختلاف ممکن نہیں کہ غالب نے غزل میں غم کے حوالے کو بھی وسیع المشربی کے زمرے میں رکھا ہے مضمون "انساں ہونا" میں یہ بحث ایک منطقی انجام کو پہنچتی نظر آتی ہے ــ اس مضمون میں بتایا گیا ہے کہ " غالب کا انسان خدا پرست بھی ہے اور انسان دوست بھی ہے ــــــ" اور یہی دو خوبیاں مصنّف نے غالب کی شخصیت میں بطور خاص تلاش کی ہیں گویا غالب تمام عمر اپنے ہی

نظارے میں مصروف رہا اور یوں اپنا آئیڈیل بھی وہ خود ہی بنا رہا۔ یہ بحث انا کے مسئلے پر بھی روشنی ڈالتی ہے۔ سلطان صدیقی نے غالب کے انسان کا مقابلہ اقبال کے انسان سے کیا ہے اور بتایا ہے کہ اقبال کا انسان مردِ مسلمان ہے۔ جو خاص مومنانہ کردار کا حامل ہے جب کہ غالب کا انسان ایک عام آفاقی انسان ہے جس میں خامیاں ضرور ہیں لیکن جو عام معنوں میں حقیقت پسند ہے اور مذہب ملت اور رنگ و نسل کی تمیز کو اہمیت نہیں دیتا اور جس کے کردار کی بنیاد انسان دوستی اور وسیع المشربی پر قائم ہے۔ خطوطِ غالب میں ظرافت کی تلاش کرتے ہوئے بھی سلطان صدیقی جس غالب کا عرفان حاصل کرتے ہیں وہ وہی انسان دوست اور وسیع المشرب غالب ہے۔ جس کو وہ پہلے ہی پہچان چکے ہیں

جیسا کہ شروع میں کہا جا چکا ہے سلطان صدیقی نے غالب کا مطالعہ تہذیبی سماجی اور سیاسی پس منظر میں کیا ہے اور نفسیاتی مطالعے کو اس مطالعہ کے تابع رکھا ہے۔ اس رائے کی تائید ان کے ہر مضمون سے ہوتی ہے۔ غالب اور خدا میں انہوں نے خدا کے بارے میں رائج نظریات کی روشنی میں گفتگو کی ہے۔ اور بتایا ہے کہ غالب نے خدا کے بارے میں جو بھی خاص نظریہ قائم کیا اس کے لئے واضح تہذیبی پس منظر موجود تھا ایک اور مضمون "غالب تہذیبی سنگم پر" میں وہ لکھتے ہیں کہ غالب نے سیاسی افراتفری میں تصوف کو جائے پناہ جانا ـــــ سلطان صدیقی کے مضمون "غالب تہذیبی سنگم پر" اور "غالب کا سماجی شعور" ان کے طرزِ فکر اور رجحانات اور نظریات کی پوری طرح وضاحت کرتے ہیں ان دونوں مضمونوں میں انہوں نے اس مخصوص تہذیبی ـــــ سیاسی اور معاشرتی ماحول اور انتشار کا مطالعہ کیا ہے جس میں غالب کو زندہ رہنا پڑا تھا۔ خطوطِ غالب کا مطالعہ بھی اسی انداز میں کیا گیا ہے اور انہوں نے بجا طور پر ان خطوط کو جن میں نہ صرف عام سماجی حالات بلکہ اشیا کی گرانی کے ساتھ ساتھ ان کی بھاؤ تک کا ذکر ملتا ہے اسی زمانے کے معاشرتی، سیاسی اور تہذیبی حالات کا عکس کہا ہے۔ غالب خستہ کے بغیر میں غالب

کے احساس غم کا تہذیبی اور سماجی پس منظر تلاش کیا گیا ہے اور اس سلسلہ میں شعر و ادب کی ناقدری سے لے کر تصوف کی انفعالیت اور معاشی ناآسودگی تک اور عزیزوں اور دوستوں کی بے اعتنائی سے لے کر غدر کی قیامتِ صغریٰ تک کو اپنے مطالعہ کے دائرے میں شامل کیا ہے اور اسی پسِ منظر میں غالب کی انانیت ــــــ جدت پسندی ـــــ اور خوشامد کا تجزیہ بھی کیا ہے۔ سلطان صدیقی نے غالب کی جدت پسندی اور انانیت کو بھی احساسِ غم کا نتیجہ قرار دیا ہے اور یہ محض اس لئے ممکن ہوا کہ بقول ان کے "غالب غم آشنا ہے غم پرست نہیں ــــ اور یہ غم تخیلی یا فلسفیانہ نہیں ـــــ بقول رشید احمد صدیقی یہ غم "کھائی گئے گیا ـــــ" کا غم ہے جس کا واضح مطلب یہ ہوا کہ اس غم کا ایک خاص سماجی معاشی اور تہذیبی پس منظر ہے جس پر سلطان صدیقی نے بطور خاص زور دیا ہے

سلطان صدیقی کو غالب سے محبت بھی ہے اور وہ اس سے مرعوب بھی ہیں ۔ لیکن غالب کا رعب اور خود ان کی محبت مطالعے کو جذباتی کہیں نہیں بناتی ۔ وہ جہاں غالب کی عظمت کو نمایاں کرتے ہیں ۔ وہاں اس کی کمزوریوں اور خامیوں کو بھی نظر انداز نہیں کرتے ۔ دستنبو کے بارے میں ان کی رائے مثال کے طور پر پیش کی جاسکتی ہے۔ غالب نے جو کبھی خوشامد سے کام لینے کی کوشش کی سلطان صدیقی نے اس کا ذکر بھی کر دیا ۔ انہوں نے جہاں غالب کو انسان دوست اور وسیع المشرب کہا ۔ وہاں اسے ایک عام آفاقی انسان بھی قرار دیا ۔ مطالعۂ غالب میں انہوں نے بعض دبے ہوئے یا کم معروف پہلوؤں کو بھی نمایاں کیا ۔ مثلاً غالب کا تصور خدا ـــــ یہ تمام مضامین ایک مخلص اور انصاف پسند ذہن کی تخلیق ہیں ـــــ اور عرفانِ غالب میں ہماری راہ نمائی کا فریضہ انجام دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں اسی لئے میں نے کہا تھا کہ غالب پر لکھی جانے والی کتابوں کے خزانے میں مضامین کا یہ مجموعہ ایک عمدہ اضافہ ہے۔

غالبؔ اور خدا

حیاتِ انسانی کے لاتعداد اور گوناگوں مسائل میں سب سے اہم مسئلہ خدا کی تلاش و جستجو رہا ہے اور آج یہ بات تقریباً سب ہی درست تسلیم کرتے ہیں کہ اس جہانِ آب و گِل کی ساری ہما ہمی اور مظاہرِ فطرت کی تمام نیرنگیاں بظاہر ان گنت اور گوناگوں ضرور نظر آتی ہیں مگر حقیقت میں یہ سب ایک ہی خدا کے مختلف جلوے ہیں اور یہ ساری کائنات اس کی حسین جلوہ گاہ ـــــ لیکن اس فیصلہ پر فکرِ انسانی سینکڑوں صدیوں کی تحقیق و تفتیش اور کدو کاوش کے بعد پہنچی ہے اور دنیائے انسانیت میں افکار و نظریات اور تصورات و اعتقادات کے وہ پُر نور چراغ جو آج بڑے وقار کے ساتھ جگمگاتے نظر آتے ہیں کئی تہذیبوں کی شعوری تگ و تاز اور علم و دانش کا نتیجہ ہیں تاہم اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ اس فیصلہ پر پہنچنے میں جہاں دنیا کے علوم و فنون اور فلسفہ و سائنس نے انسانی عقل و فہم کی پوری پوری رہبری کی ہے وہاں بیشتر مذاہب نے بھی وحدتِ الٰہی کی تعلیم بڑے مؤثر اور واضح انداز میں دی ہے جس سے انسان نہ صرف شک و شبہ اور خرافات و مکروہات کی گرفت سے آزاد ہو گیا بلکہ اس کی حقیقت شناس نگاہوں نے ایک ایسے خدا کا جلوہ دیکھ لیا جس کے سوا سارے خداؤں کا وجود غیر حقیقی ہو جاتا ہے مگر کچھ مذاہب ایسے بھی ہیں جن کی تعلیمات نے خدائے برتر کی اہم صفات کو بھی جُداگانہ خداؤں کی حیثیت دے دی یا ان کو ایک ہی خدا کے

لہ غالب نمبر ، ماہِ نو ، کراچی ، فروری ۱۹۷۰ء

مختلف روپ تصور کر لیا۔

مثلاً برہمنی مذہب نے خدا کے خالق کائنات ہونے کی صفت اور اس عالم ہست و بود کے فنا اور بقا کی قدرت کو علیحدہ علیحدہ برہما وشنو اور شیو کے نام سے متصّف کر دیا۔ یا پارسیوں نے اس کائنات کی تخلیق کو آہورا مزدا (Ahura-Mazdu) اور انگرامنی (Angra Manyo) یعنی خیر و شر یا نیکی و بدی کی دو بڑی طاقتوں کی ازلی و ابدی کشمکش کا نتیجہ قرار دیا لیکن انسان کے متعلق مجوسیوں کا عقیدہ بھی یہی ہے کہ اس کی تخلیق آہورا مزدا (Lord of Good and Wisdom) نے عقل و فہم دے کر کی ہے تاکہ وہ برائی کے آڑھے ٹیڑھے اور غیر واضح راستوں سے نہ صرف اپنے لئے خیر کی راہ تلاش کر سکے بلکہ اُن پر پوری کامیابی سے جہد آزما بھی ہو سکے۔ مذہب اسلام میں بھی برائی کی طاقت (Evil Spirit) کا تصوّر موجود ہے لیکن اس کا انداز نظر پارسیوں کے عقیدے اور نصب العین سے قطعی مختلف ہے۔

اسلام نے جس برائی کا تصوّر پیش کیا ہے اس کا نہ تو تشکیل کائنات سے کوئی واسطہ ہے اور نہ ہی اپنی تخلیق سے کوئی تعلق ـــــ بلکہ اس کی تخلیق بھی خدائے برتر نے اعلےٰ صلاحیتوں اور توانائیوں کے ساتھ کی تھی مگر اس نے ان صلاحیتوں کو غلط روش پر ڈال کر ممنونیت کے بجائے سرکشی اختیار کر لی اور خود کو بارگاہ ایزدی میں اپنے اعمال سے معتوب بنالیا۔

یہ برائی کی طاقت اہرمن کی ہے لیکن قرآن حکیم کی تعلیمات کے مطابق مسلمان کا خدا اپنی ذات و صفات کے اعتبار سے منفرد، یکتا اور کامل ہے۔ وہی ربّ العالمین بھی ہے اور ساری مخلوق کا خالق و مالک بھی، وہی سب کو مارتا اور جلاتا ہے (الذی یحیی و یمیت) وہی سب کا ناصر و مددگار ہے۔ اس طرح وہ بیک وقت برہما، وشنو اور شیو بھی ہے اور آہورا مزدا بھی ـــــ

یہاں اس امر کا جائزہ لینے کے لئے کہ غالب کا تصوّر خدا کیا ہے اور اس نے اپنے خالق کے حضور کیا کیا جدت طرازیاں اور بوالعجبیاں روا رکھی ہیں اس

کی ہستی اور حیات و کائنات کا اظہار اپنی شاعری میں کس انداز اور کس طریقہ سے کیا ہے ہمیں شاعر کے کلام اور اس کی رفتار زندگی پر نظر ڈالنا ہوگی ـــــ تب ہی ہم کسی نتیجہ پر پہنچ سکیں گے۔

تخلیقات غالب کے مطالعہ سے جو تصوّرِ خدا ہمارے ذہن میں ابھرتا ہے۔ قطع نظر اس کے کہ وہ کس مذہب اور کس مسلک سے مطابقت اور مماثلت رکھتا ہے اور کس قدر رکھتا ہے یہ بات واضح طور پر سامنے آجاتی ہے کہ غالب اس خدائے واحد کے قائل ہیں جس کا وجود حقیقی بھی ہے اور یکتا بھی۔ جس نے نہ صرف سارے جہانوں کو تخلیق کیا بلکہ اس کی صفات کا رچاؤ جملہ موجوداتِ عالم میں پوری طرح کارفرما ہے تاہم اس حقیقت کل نے اپنی ذات کے گرد وپیش رمز و ایما کا ایسا پردہ چھوڑ رکھا ہے جس کا اٹھانا ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔ صرف حقیقت شناس اور بصیرت افروز نگاہیں اس پردے کے پیچھے وحدت الٰہی کا جلوہ دیکھ سکتی ہیں ؎

کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے　　پردہ چھوڑا ہے وہ اس نے کہ اٹھائے نہ بنے
اسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا　　جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دوچار ہوتا
سبکو مقبول ہے دعویٰ تری یکتائی کا　　روبرو کوئی بُت آئینہ سیما نہ ہوا

زہے ہستئ محضِ عین وجود　　کہ نازد بہ یکتائیش ہست و بود

غالب نے اپنے تصوّرِ خدا کی بڑی واضح تصویریں اور دلکش پیکر "مثنوی ابر گہربار" میں پیش کئے ہیں۔ جن سے ان کے افکار و نظریات کی عکاسی بڑی حد تک ہوتی ہے۔ غالب کے نزدیک ہر انسان خواہ کسی مذہب اور کسی مسلک سے تعلق رکھتا ہو خدائے واحد کی پرستش کسی نہ کسی انداز اور کسی نہ کسی صورت میں ضرور کرتا ہے۔ کوئی شخص بُت کو سجدہ کرتا ہے تو محض اس لئے کہ بُت میں بھی خدا کا جلوہ دیکھ لیتا ہے آگ میں خدا کا پتہ لگا لینا بیوقوفی کہی جاسکتی ہے مگر حقیقت تو یہ ہے کہ وہ لوگ جو آگ کی پرستش کرتے ہیں، ان کے جسم ہی اگنی پوجا کرتے دکھائی دیتے ہیں دل ان کے بھی خدا کے ہی گن گاتے ہیں وہ گروہ جو راہبوں، جوگیوں اور فقراء سے

منسوب کیا جاتا ہے وہ بھی خدا ہی کی تلاش میں جنگل جنگل اور پربت پربت مارا مارا پھرتا ہے ۔ جو نمازی ہیں اس کے آگے سرِ نیاز خم کر ہی لیتے ہیں لیکن وہ بدمست جنہیں اپنے تن بدن کا ہوش نہیں رہتا وہ بھی اپنی آنکھیں اسی کی طرف کھلی رکھتے ہیں اگر کافر ہیں تو اسی کی پناہ کے خواستگار ہیں ــــ مومن بھی اسی کی پرستش کرتے ہیں وہ جنہوں نے دانشِ نورانی کی بدولت کائنات پر غور و فکر کر کے خالق کائنات کو پہچان لیا اور کہا کہ وہی حق ہے ۔ ان کی آواز عالم بالا تک ــــ پہنچ گئی ۔ اور وہ جنہوں نے من و تو کا پردہ اٹھا کر خود کو ہی حق کہہ دیا وہ بھی راست گفتار ہیں گو یہ بات اعلےٰ ظرفی اور شریعت کے منافی ضرور ہے ۔ غالب عبادت و ریاضت میں اس بھید بھاؤ اور رنگا رنگی کی وجہ بس یہ سمجھتے ہیں کہ اس کے پرستار بیشمار اور اَن گنت ہیں اور وہ جس کی پرستش کی جا رہی ہے صرف ایک ہے ؎

ہر لب کہ جوئی نوائے از دوست
ہر سر کہ بینی ہوائے از دوست

بر بت سجدہ زاں رو روا داشتہ
کہ بت را خداوند پندا اشتہ

زبس دادِ نا آشنائی دہند
بآتش نشانِ خدائی دہند

بہ تن ہا بر آذر گرائش کناں
بدل ہا خدا را نیائش کناں

گروہے سراسیمہ در دشت و کو
خداوند جوئی و خداوند گو !

مناجاتیاں پیش وے در نماز
خراباتیاں را بدو چشم باز !

اگر کافر انند زنہار کیش
دگر مومناں در پرستاریش

ہوالحق سرایانِ او عیب جو
انا الحق نوایانِ او تلخ گو!
نظرگاہِ جمع پریشاں یکے ست
پرستند اہنوہ و یزداں یکے ست

غالب کا یہی مسلک کہ نور الٰہی کی تجلیاں کائنات بسیط میں ہر جگہ موجود ہیں۔ حرم ہو کہ دیر۔ مسجد ہو کہ کلیسا۔ ان میں وسیع القلبی، لے علے مشربی اور انسان دوستی کا ہمہ گیر جذبہ پیدا کر دیتا ہے اور ان میں ہر انسان بلا تخصیص مذہب و ملت اسی جلوہ ذات سے روشنی حاصل کرتا دکھائی دیتا ہے اور یہ حقیقت بھی ہے کہ تمام سچے مذاہب کے بنیادی امور یکساں ہیں۔ اصل دین ازلی سچائی اور ابدی صداقت ہے جو ناقابل تغیر و تبدل ہے۔ حصولِ مقصد کے راستوں اور طریقوں میں ہر قوم و مذہب کے زمانی و مکانی اثرات کے سبب تبدیلیاں رونما ہوتی رہی ہیں اسی لئے غالب مذہب کے قائم کردہ حدود و قیود، روایتی بندھن اور مقرر کردہ طرز زندگی کو انسان کیلئے ضروری نہیں سمجھتے۔ ؎

مقصود ما زِ دیر و حرم جز حبیب نیست
ہر جا کنیم سجدہ بداں آستاں رسد

وفاداری بشرطِ استواری اصل ایماں ہے
مرے بتخانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

دیر و حرم آئینۂ تکرار تمنا!
واماندگی شوق تراشے ہے پناہیں!

غالب خدا کو حسن حقیقی و ازلی سمجھتے ہیں جس کی موجودگی میں کسی پری چہرہ کا غمزہ و عشوہ و ادا، زلف عنبریں، چشم سرمہ سا اور مظاہر فطرت کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی کیونکہ ان کی موجودگی انسان کو اکثر دھوکا دے دیتی ہے۔ اور اس کے لئے وجود ممکنات اصنام خیالی بن کر رہ جاتا ہے جن کی نیرنگیوں میں الجھ کر اور واحد کو کثیر سمجھ کر ظاہر بین نگاہیں موحد سے مشرک بن جاتی ہیں۔ اسی لئے غالب خدا سے پوچھتے ہیں ؎

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے؟
یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں؟
غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے؟
شکن زلف عنبریں کیا ہے؟
نگہ چشم سرمہ سا کیا ہے؟
لالہ و گل کہاں سے آئے ہیں؟
ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے؟

لیکن جب غالب اپنے ذہن رسا اور چشم بینا کی رفاقت میں اس طلسم رنگ و بو کا گہرا مشاہدہ اور تجربہ کرتے ہیں تو انہیں وجود ممکنات اس لئے ضروری معلوم ہوتا ہے۔ کہ حسن کی فطرت ازلی اپنی خودنمائی اور اظہار و انکشاف ہے لیکن اس ذات واحد کا حسن اس قدر لطیف اور غیر مرئی ہے کہ وہ اپنا مشاہدہ کسی مادی شے کا رنگ روپ دھارے بغیر نہیں کر سکتا۔ جس طرح آئینے میں صفتِ انعکاس بلا زنگار پیدا نہیں ہوتی۔ اسی لئے غالب پوری کائنات کو اسی حسنِ کامل کی جلوہ گاہ اور آئینۂ علم و آگہی سمجھتے ہیں کہ جب بھی نظر ڈالی جائے اس کی ذات و صفات کے جلوے ہر سو بکھرے نظر آتے ہیں۔

یہ ضرور ہے کہ اس نے اپنی صفات کے اظہار میں وہ رنگا رنگی دکھائی ہے کہ بظاہر غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے لیکن اسی پر غور کیا جائے کہ مستوں کو سرخوشی

اور عاشقوں کو آہ کس نے دی ؟ زمین میں قوّت نمو کہاں سے آئی ؟ بادل کو ایسا آبِ حیات کس نے بخشا کہ پیاسی زمین میں جان ڈال دے۔ بانسری کو ایسی مدھ بھری لے کیونکر ملی۔ کہ الاپے تو لوگ لہرا کر پی جائیں، شراب میں یہ روشنی اور گرمی کیسے پیدا ہو گئی کہ میخوار کے ماتھے پر ستارے جگمگا اٹھیں اور حسینوں کو ایسے انداز دلبری کس نے دیئے کہ ساقی بھی دیکھ لے تو عاشق ہو جائے ـــــ تو نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ ـــــــ

ـــــــ یہ سب اسی معشوق حقیقی کے ذوق مشاہدہ کی دل فریب نیرنگیاں ہیں اور جو آواز بھی مختلف پردوں سے نکلتی ہے وہ اسی کی نوائے رنگیں ہے ؎

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی
چمن زنگار ہے آئینۂ باد بہاری کا

❖

دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بین

❖

ہے کائنات کو حرکت تیرے ذوق سے
پرتو سے آفتاب کے ذرے میں جان ہے

❖

جہاں چیست آئینۂ آگہی
فضائے نظرگاہِ وجہ اللّٰہی!

بہ مستاں نشید و لعشاق آہ
باہن کلید و بہ زر نام شاہ!

بہ ابر، از پئے خاک آب حیات
بہ خاک از نم ابر جوشش بنات

بہ مے در فروغ کہ چوں برکشند
ز سیمائے میخوارہ نیّر دمد

بہ نے در نوائے کہ چوں برکشند
بہ آواز آں نالۂ سامغر کشند

بہ ساقی خرامے کہ از دلبری
زِ شاہد برد دل بہ ساقی گری!

بہ شاہد ادائے کہ از سرخوشی
بہ ساقی دہد داردئے بے ہشی

ز ہر پردہ پیدا نوا سازیے
بہر جلوہ پنہاں نظر بازیے

٭

بظاہر اشیاء کائنات کی ہیئت و ماہیت جدا جدا اور الگ الگ ہو سکتی ہے لیکن سب سے پر لطف اور قابل تعریف بات یہ ہے۔ کہ تمام موجودات عالم میں یہ رنگا رنگی اور جلوہ سامانی اپنی جگہ اس قدر مناسب و موزوں طور پر موجود ہے۔ کہ اگر مقررہ مقام اور معینہ جگہ سے ذرا ہٹا دیا جائے تو نظام عالم میں نہ نظم و ضبط باقی رہے۔ نہ دلکشی و رعنائی۔

زہر پردہ رنگے کہ گیرد کشاد
چناں دلکش افتد کہ بے اُس مباد

غالب کہتے ہیں انسان کی تخلیق بھی خدا نے ہی عقل و فہم کی صفات دے کر کی ہے۔ تاکہ وہ رمز و ایما کی عقدہ کشائی کر سکے۔ اور زبان کو اظہار و بیان کی وہ قوت و لطافت بخشی کہ وہ ہر لحظہ رنگین بیانی کرتی نظر آتی ہے۔ مگر جب اس پر غور کیا جائے کہ حرف و لفظ کا رشتہ کس طرح قائم ہوا اور اس پردہ سے جو دلکش نغمہ ابھرتا ہے وہ کیونکر ابھرتا ہے؟ تو عقل حیران رہ جاتی ہے۔ اگر یہ خیال کیا جائے کہ اس میں دل کی کرشمہ زائیاں اور کیف باریاں بھی شامل ہیں تو یہ خیالِ خام ہے۔ دل تو ایک قطرۂ خوں کے سوا کچھ بھی نہیں ؎

نگارندۂ پیکرِ آب و گِل
شمارندۂ گوہرِ جان و دِل

خدایا زبانے کہ بخشیدۂ
بہ نیروئے جانے کہ بخشیدۂ

دمادم بہ جنبش گر آید ہمی!
زِ رازِ تو حرفے سراید ہمی!

نہ دانم کہ پیوندِ حرف از کجاست
دریں پردہ لحنے شگرف از کجاست

گر از دل شناسم جنوں بیش نیست
کہ آں نیز یک قطرہ خوں بیش نیست

ؒ

غالبؔ خدا کی صفات کو کثیر تو مانتے ہی ہیں لیکن اس بات پر بھی ایمان رکھتے ہیں کہ ان میں روز و شب تغیر ّ تبدّل ہوتا رہتا ہے اور ان کی ہیئت ہمہ وقت بدلتی، سنورتی، اور نکھرتی رہتی ہے جس کا علم حاصل کرنا مقصودِ حیات انسانی ہے۔ لیکن یہ علم خدا کی مخفی صفات پر کافی غور و فکر کے بعد ہی حاصل ہو سکتا ہے۔ اور جس قدر ایک انسان یہ علم حاصل کرتا ہے اسی قدر وہ حقیقت سے قریب ہو جاتا ہے۔ اس میں وہ دانشِ نورانی جلوہ گر ہو جاتی ہے۔ جو اسے عرفانِ ذات کی منزل سے آگے معرفت الٰہی کی راہ پر گامزن کر دیتی ہے۔ اور وہ نہ صرف زمین کی بے شمار آسائشوں اور آسمان کی لاتعداد برکتوں سے ہمکنار ہو جاتا ہے۔ بلکہ خدا کو بھی اس کی صفات کی بدولت پہچان لیتا ہے۔ کیونکہ چیزوں کی ماہیت ہی سے خالق کی عظمت اور صفات کے علم سے ہی صانع کی فنکاری کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے غالبؔ اپنے اس نظریئے کا اظہار نہایت دلکش انداز میں اسطرح کرتے ہیں ؎

آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

ؒ

علامّہ اقبال نے بھی اس حقیقت کا انکشاف اپنے مخصوص انداز میں کیا ہے ؎

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید
کہ آ رہی ہے دمادم صدائے کن فیکون

ؒ

جاگ بھی ... گو صداقت کا اظہار اپنی شاعری میں ضروری سمجھتے ہیں ؎

بنا بنا کے جو دُنیا مٹائی جاتی ہے
ضرور کوئی کمی ہے جو پائی جاتی ہے

ؐ

یہ بات تقریباً سب ہی جانتے ہیں کہ غالبؔ کی بیشتر زندگی محرومیوں اور نامرادیوں سے دوچار رہی۔ حسرتوں کا شمار کرتے گزری ——— ناسازگار حالات سے نبرد آزما رہنے میں بیتی ——— دوست احباب اور رشتہ داروں کی سرد مہری کا مزا بھی چکھا لیکن ان حالات میں بھی وہ مشاہدِ حقیقی کو کبھی فراموش نہ کر سکے ؎

گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

ؐ

بیگانگیٔ خلق سے بیدل نہ ہو غالبؔ
کوئی نہ ہو تیرا تو مری جان خدا ہے

ؐ

کبھی کبھار پریشان حالی اور دل گرفتگی میں اپنے خدا سے کچھ کہہ دیتے ہیں تو یہ درخورِ اعتنا نہیں ——— شدید جذبات کے تحت وقتی طور پر کچھ کہہ دیا جائے تو وہ نظریہ یا عقیدہ کبھی نہیں ہوتا ——— غالبؔ کا یہ کہہ دینا کہ ؎

ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے یا

"کیا وہ نمرود کی خدائی تھی" شکوہ و شکایت ضرور ہے۔ لیکن نظریہ نہیں۔ بعض اہل الرائے اس بات پر متفق ہیں کہ غالبؔ کے خیالات اور نظریات میں تشکیک و تضاد کی فضا موجود ہے۔ جو ہر جگہ قائم و برقرار رہتی ہے۔ غالبؔ کے نظریۂ خدا کا جہاں تک تعلق ہے مجھے

اس رائے سے اتفاق نہیں۔ اس رائے کو درست بھی تسلیم کر لیا جائے تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔ تعریف کی ضرورت ہے ——————

کیونکہ غالب نہ فلسفی ہیں اور نہ کبھی ایسا دعویٰ کیا۔ وہ صرف ایک فنکار شاعر ہیں۔ فلسفہ سے شاعری کی اہمیت بڑھتی نہیں گھٹتی ہے۔ اور شاعر شاعر کم اور ناصح زیادہ بن جاتا ہے۔

فلسفی ایک مربوط اور منتظم نظام فکر رکھتا ہے۔ اور ہر بات کو اپنے قائم کردہ نظریہ کے حدود و قیود میں جس طرح ممکن ہو بنا سنوار اور سجا کر پیش کر دیتا ہے۔ جس سے آئندہ گریز ممکن نہیں اسی لئے اکثر وہ متحرک اور تیزی سے بدلتی ہوئی زندگی کے تقاضوں کو بطریق احسن پورا نہیں کر پاتا۔ لیکن تشکیک و تذبذب کی کیفیت ایک شاعر میں تلاش و جستجو کا ذوق و شوق پیدا کرتی ہے۔ یہی ذوق تجسس اسے حیات و کائنات کا مطالعہ نئے طریقوں اور نئے زاویوں سے کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ جس سے اس کی فکر و نظر میں وہ بصیرت اور روشنی پیدا ہو جاتی ہے۔ کہ وہ زندگی کی رمزیت اور معاشرے کے تقاضوں میں پھیلاؤ اور تبدیلی کے ساتھ ساتھ جو نئی حقیقتیں جلوہ گر ہوتی ہیں ان پر اپنے نظریئے کی اساس قائم کرتا ہے تاہم اس صداقت کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے۔ کہ زندگی متحرک شے ہے۔ تیزی سے بدلتی رہتی ہے۔ جس قدر زندگی آگے بڑھتی ہے۔ نئی معلومات اور نئے انکشافات ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ جن کی روشنی میں عین ممکن ہے۔ کہ شاعر کا ایک نظریہ جو پہلے قائم ہوا تھا۔ وہ یکسر بدل جائے۔ اور اس کی جگہ نیا عقیدہ جنم لے لے لیکن شاعر اس نئے تصور کو بھی بڑی بے ساختگی اور انتہائی صاف گوئی کے ساتھ اپنے کلام میں پیش کر دیتا ہے۔ کہ زندگی کے مد و جزر اور ہنگامہ خیزی کی صحیح عکاسی ہو جاتی ہے۔ یہی شاعری کا حسن ہے۔ اور فن کا کمال ——

غالب کے ہاں بھی تشکیک و تضاد کی کیفیت اگر ملتی ہے تو اسی لئے کہ وہ حقیقت کے متلاشی رہتے ہیں اور یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہتا ہے جب

تک ان کی تسلّی و تشفّی نہیں ہو جاتی۔

غالب شاہد حقیقی کے پرستار ضرور ہیں لیکن انسانیت کا احترام اور اُس کے حقوق کی نگہداشت ہر موقعہ اور ہر مقام پر ملحوظ رکھنا اپنا فرض اوّلین سمجھتے ہیں ـــــ چاہے بارگاہِ ایزدی ہی کیوں نہ ہو۔ جس کی بڑی وجہ جدت پسندی اور عزّت نفس کی وہ اعلےٰ صفات ہیں جو غالب کو اس کے خالق کی طرف سے ودیعت کی گئی تھیں ـــــ یہی خصوصیات ان میں انانیتّ کا شعور ابھارتی ہیں جس سے ان کی شاعری میں جدید لب و لہجہ پیدا ہوا۔ یہاں یہ عرض کر دینا بھی ضروری ہے کہ اردو شاعری کی تاریخ میں غالب ہی وہ پہلے شاعر ہیں جن پر خودی کا مفہوم سب سے پہلے واضح ہوا۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کی مہذب اور نکھری ہوئی شکل اقبال کے ہاں ملتی ہے۔ یہی خصوصیات انہیں شاعری کی مقرّرہ رسم اور مروّجہ نظریات سے دامن سمیٹنے اور صرف نظر کرنے پر اکثر مجبور کر دیتی ہیں۔ اور ان کی فکر رسا کوئی ایسی راہ اپنے لئے تلاش کر لیتی ہے۔ جو عام روش اور مقررہ دستور سے کچھ نہ کچھ منفرد بھی ہوتی ہے۔ اور بے بدل بھی ـــــــــــــــــــــــــــــ

ـــــ مگر قابل ستائش یہ بات ہے۔ کہ اس راہ نوردی میں غالب جن جن نئے مراحل سے گزرتے، تجربات سے روشناس ہوتے اور مشاہدات سے واقفیت حاصل کرتے ہیں ان کو وہ اپنی خداداد اعلےٰ صلاحیت اور فنی بازیگری سے ایسے نت نئے انداز میں ہمارے سامنے پیش کر دیتے ہیں کہ ارباب علم و بصیرت کے اذہان میں فکر و نظر اور علم و آگہی کے کئی دیپک جل اٹھتے اور کئی شمعیں فروزاں ہو جاتیں ہیں۔

چنانچہ جدت پسندی، انانیت، تجربہ اور تلاش کا یہی حسین اور متوازن امتزاج جو غالب کی طبیعت کی ایک اہم خصوصیت ہے۔ اس وقت بھی قائم و برقرار رہتا ہے۔ جب غالب بارگاہ ایزدی میں حاضر ہوتے اور اس سے ہمکلام ہوتے ہیں وہ خود کو گناہگار ضرور سمجھتے ہیں لیکن دوسرے گناہگاروں کی طرح گڑگڑاتے

روتے، اور سرِ بندگی سے نظریں جھکاتے نظر نہیں آتے بلکہ خدا سے دو بدو باتیں کرتے ہیں۔ ایسی باتیں جن میں لگاوٹ بھی ہے۔ اور کھچاوٹ بھی — تکرار بھی ہے۔ اور عجز بھی — شوخی بھی ہے اور احترام بھی — کبھی دونوں جہان دے کر بھی خوش نہیں ہوتے لیکن احتراماً "تکرار" کرنا بھی مناسب نہیں سمجھتے۔

دونوں جہان دے کے وہ سمجھے یہ خوش رہا
یاں آپڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں

☘

کبھی انہیں یہ دنیا بازیچۂ اطفال معلوم ہوتی ہے اور خدا سے دریافت کرتے ہیں۔ "تمنا کا دوسرا قدم کہاں ہے؟" "یہ "دشتِ امکان" تو ایک نقشِ پا کے سوا کچھ بھی نہیں۔

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب
ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

☘

کبھی بندگی میں بھی وہ آن بان اور تمکنت ہے۔ کہ درِ کعبہ وا نہو تو کھلنے کا انتظار نہیں کرتے، واپس چلے آتے ہیں ؎

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود بیں ہیں کہ ہم
الٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

☘

کبھی فرشتوں کے نامۂ اعمال لکھنے پر شکایت ہے ؎

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا!

☘

کبھی کہتے ہیں میری نالائقی پر ترس کھا کر یونہی بخش دے۔ مفلس و درماندہ ہوں۔ میرے اعمال کو ترازو پر نہ رکھ — اگر اعمال تولے گئے تو میرے زخم

پھر سے ہرے ہو جائیں گے۔ عمر بھر کی تکلیفوں اور نارسائیوں کا وزن بھی تو دیکھ۔ اوروں کے نامہ اعمال میں اگر قول و عمل کا سرمایہ ہے، ہوا کرے۔ میرا سرمایۂ حیات تو درد و رنج کے سوا کچھ بھی نہیں اور یہ بھی تیرا ہی دیا ہوا ہے پھر اس کا پوچھنا گچھنا کیا ؂

بہ بخشائے برنا کسی ہائے من
تہی دست و درماندہ ام وائے من
بدوش ترا زد مسنہ بارِ من !
نہ سنجیدہ بگزار کردار من —!

بہ کردار سنجی میافزائے رنج !
گراں بارئی دردِ عمرم بہ سنج

اگر دیگراں را بود گفت و کرد
مارا مایۂ عمر رنج ست و درد

چہ پرسی چوں ایں رنج و درد از تو بود
غم تازہ در ہر نورد از تو بود

٭

کبھی کہتے ہیں تجھے معلوم ہے میں کافر نہیں ہوں۔ آگ اور سورج کی پوجا نہیں کی، نہ یہ شیطانی و بدمعاشی مجھ سے سرزد ہوئی کہ کسی بندۂ خدا کو جان سے مار دیا ہو۔ یا کسی کا مال و اسباب لوٹ لیا ہو۔

نہ کشتم کسے را بہ اہرمنی
نبردم زِ کس مایہ در رہزنی۔

٭

زیادہ سے زیادہ جرم گیا ہے تو یہی کہ شراب پی ہے اور شراب بھی کیا پی ہے کبھی ہاتھ آ بھی گئی تو وہ اسباب عیش و نشاط میسر نہ آ سکے جو شراب کے لوازمات میں سے ہیں۔ بادہ نوشی اور رنگ رلیوں کا حساب ہی لینا ہے تو جمشید بہرام اور پرویز جیسے بادشاہوں سے لے جنہوں نے شراب کی مستی میں دشمن کے دل اور بدخواہ کی آنکھ میں جلتی سلائی ڈالدی۔

حسابِ مئے و رامش و رنگ و بو
زِ جمشید و بہرام و پرویز جو
کہ از بادہ تا چہرہ افروختند۔
دلِ دشمن و چشمِ بد، سوختند

ٍٍ

میں نے اگر شراب پی ہے تو اس لئے کہ میں کشتۂ غم تھا۔ اور شراب کی خاصیت غم غلط کرنا بھی ہے۔ پھر تو ہی بتا میں شراب نہ پیتا تو کیا کرتا ؎

من اندوہ گین و مئے اندوہ رُبا
چہ می کردم اے بندہ پرور خُدا

ٍٍ

کبھی ناکردہ گناہوں کی جو حسرت دل میں باقی رہ گئی ہے۔ اس کی نہ صرف داد و تحسین طلب کرتے ہیں بلکہ اسے مجبور کرتے ہیں کہ گناہوں کا حساب مجھ سے نہ مانگ اور میری سزا کے خیال سے درگذر کر کیونکہ میرے گناہوں سے وہ حسرتیں اور آرزوئیں کہیں زیادہ ہیں جو حالات کی ناسازگاری کے سبب دل کے اندر ہی اندر تڑپ اور کراہ کر دم توڑ گئیں جن کا خوں بہا تجھ پر واجب ہے۔ جو اسی صورت میں معاف کیا جا سکتا ہے۔ کہ تو میرے گناہوں کی باز پرس نہ کرے اور میری نجات کا پروانہ جاری کر دے ؎

آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد
مجھ سے مرے گناہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

غالب کے تصور گناہ میں بھی ایک نیا فکری آہنگ اور بدلا ہوا احساس ملتا ہے جو اُن سے قبل یا اُن کے ماحول میں کہیں اور نظر نہیں آتا۔ وہ گناہ کو حیات انسانی کے لئے ضروری سمجھتے ہیں۔ اسی لئے کہ یہ خدا کی شان عفو و درگزر اور صفت رحم و کرم کے اظہار کا بہترین ذریعہ ہے۔ اگر گناہ کا وجود ہی نہ ہو تو ہر شخص متقی اور پرہیزگار بن جائے۔ اور ساری کائنات ایک عظیم معبد —— لیکن یہ نہ تخلیق کائنات کا مقصود ہے اور نہ حیاتِ انسانی کا۔

خوئے آدم دارم آدم زادہ ام
آشکارا دم زِ عصیاں می زنم

غالب اپنے گناہوں کو بھی خدا کی صفتِ مغفرت کے مقابلہ میں کوئی اہمیت نہیں دیتے اور انہیں بے حد کم سمجھتے ہیں ؎

دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک
میرا سرِ دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

غالب نے اپنے عقیدہ کا اظہار اپنے ایک خط میں بھی کیا ہے لکھتے ہیں

"........ میں موحد خالص اور مومن کامل ہوں زبان سے لا الہ الا اللہ کہتا ہوں اور دل میں لا موجود الا اللہ، لا موثر فی الوجود الا اللہ سمجھے ہوا ہوں ——"

یہ حقیقت ہے کہ غالب ذات واحد کے اس قدر پرستار ہیں کہ وہ حرص و طلب اور سود و معاوضہ کو مقصد بندگی کے قطعی منافی سمجھتے ہیں اور وہ عبادت جو جنت کی فکر اور دوزخ کے ڈر سے کی جائے ان کے نزدیک درخور اعتنا نہیں ——

غالب صرف اسی طاعت و بندگی کے قائل ہیں جو رضائے دوست کی خاطر کی جائے ؎

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

غالب ایسی جنت کے بھی طلب گار نہیں جس میں صرف شیر و شہد۔ شرابِ طہور اور حور و قصور موجود ہوں۔ نہ شورِ شغب، ہو نہ بادہ نوشوں کا دھوم دھڑکا ـــ نہ مدہوش کن گھنگھور گھٹائیں اور نہ خزاں رسیدہ بہار۔ حقیقت تو یہ ہے۔ کہ بہار کا لطف ہی خزاں سے ہے۔

دراں پاک مے خانۂ بے خروش
چہ گنجائیِ شورشِ نائے و نوش

ؑ

سیہ مستیٔ ابرِ باراں کجا
خزاں چوں نہ باشد بہاراں کجا

ؑ

رہا یہ کہ وہاں حوریں بھی ہوں گی تو ایسی حوریں کیا ہی اچھی لگیں گی جن میں نہ شاہد رعنا کی طرح وہ غمزہ و عشوہ موجود ہو کہ جب پیار کرنا چاہیں تو ہاتھ چھڑا کر بھاگ جائیں اور جھوٹی قسموں سے لتیاں اور دلاسے دے دیں۔ ان میں نہ تو تازگی ہے اور نہ شوخی ـــ نہ دل میں کوئی تڑپ اور نہ وصل کی آرزو ـــ ان کا شیوہ تو صرف اطاعت گزاری ہے۔

گریزد ز بوسہ اینش کجا
فریبد بہ سوگند دوشینش کجا

ؑ

چنانچہ غالب ایسی جنت کو جس میں جلوہ ذات باری نہو ایک خوش کن خیال اور ایک گلدستہ طاق نسیاں سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے ؎

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش کرنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

ؑ

ستائش گر ہے زاہد اس قدر جس باغِ رضواں کا
وہ اک گلدستہ ہے ہم بیخودوں کے طاقِ نسیاں کا

٭

سنتے ہیں جو بہشت کی تعریف سب درست
لیکن خدا کرے، وہ تری جلوہ گاہ ہو

٭

بعض اصحاب فکر و نظر کا خیال ہے کہ غالب نے اپنی شاعری میں جس خدا کا تصوّر اور جس حیات انسانی کا نقشہ پیش کیا ہے۔ وہ ہندی ویدانت کے "برہما" اور اس کی تعلیمات سے بڑی حد تک ملتا جلتا ہے۔ اور اپنے اس خیال کی تائید و تصدیق میں وہ کلام غالب سے بہت سے اشعار اس انداز کے پیش کرتے ہیں ؎

اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے
حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں
ہے مشتمل نمود صور پر وجود بحر!
یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں
ہے غیب غیب جسکو سمجھتے ہیں ہم شہود
ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

٭

قطرہ میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کل
کھیل لڑکوں کا ہوا دیدۂ بینا نہ ہوا

٭

عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

٭

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسدؔ
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

ٹ

قطرہ دریا میں جو مل جائے تو دریا ہو جائے
کام اچھا ہے وہ جس کا کہ مآل اچھا ہے

ٹ

ہاں کھائیو مت فریب ہستی
ہر چند کہیں کہ "ہے" نہیں ہے

ٹ

دل ہر قطرہ ہے سازِ انا البحر
ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا ہے

ٹ

نظر میں ہے ہماری جادۂ راہِ فنا غالبؔ
کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزائے پریشاں کا

ٹ

رَو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھئے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

ٹ

اس میں شک نہیں کہ محولہ بالا اشعار کے مطالعہ سے ہمارے ذہن میں ایک ایسے خدا کا تصوّر ضرور ابھرتا ہے جس کا وجود حقیقی اور کامل ہے لیکن حیاتِ انسانی کی کچھ ایسی تفسیریں اور تعبیریں بھی وضع ہو جاتی ہیں جس سے اس قدیم صوفیانہ مسلک کی نشاندہی ہوتی ہے۔ جو "من و تو" کے فرق کو یکسر ختم کرنے کے لئے انسان کو حیات و کائنات کی آسودگیوں اور لذتوں سے کنارہ کش ہونے کا درس دیتا ہے۔ مگر یہاں یہ مسئلہ غور طلب

ہے۔ کہ کیا غالب کا تصور خدا ویدانت (ہندی تصوف) کے برہما سے مماثل ہے ــــــ؟ مگر اس کے ساتھ ہی یہ سمجھنا بھی ضروری ہے کہ ویدانت میں "برہما" سے کیا مراد لی جاتی ہے ــ ہندو فلسفہ' ویدانت میں برہما یا ایشور سے مراد ایسے خدائے واحد سے لی جاتی ہے۔ جس نے صرف کائنات اور اس کی تمام چیزوں کو تخلیق کیا۔ بلکہ تمام موجودات عالم بھی اسی کی ہستی کا پرتو ہیں۔ اس لئے ان کا اپنا وجود کوئی حقیقت نہیں رکھتا محض وقتی اور اعتباری ہے جسے ویدانت "مایا" کہتا ہے۔ انسان بھی مایا ہے۔ مگر روح انسانی مایا نہیں ــــ کیونکہ روح انسانی کا تعلق براہ راست برہما سے ہے۔ اس لئے وہ ازلی بھی ہے۔ اور غیر فانی بھی ــــ تاہم نروان صرف ایسی روحیں حاصل کر پاتی ہیں جو خود کو اس ذات حقیقی میں جذب کر دیتی ہیں۔

روح کا یہ انضمام ویدانت کے نزدیک نفس انسانی کا بڑا ہی اعلےٰ وارفع مقام ہے۔ جو بڑی جانکاہی اور جگر سوزی کے بعد حاصل ہوتا ہے۔ جس کی بڑی وجہ یہ ہے۔ کہ وہ ذات حقیقی مادیت سے قطعی بالاتر اور منزہ ہے اس لئے روح انسانی اس ذات میں جب ہی ضم ہو سکتی ہے جب وہ خود بھی تمام مادی علائق سے پاک و صاف ہو۔

ویدانت کے نزدیک حیات و کائنات کی گوناگوں پیچیدگیوں اور ہمہ گیر ذہنی انتشار کا سبب محض خواہشات انسانی اور ضروریات زندگی ہیں۔ جن کا سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوتا۔ اور انسان انہیں پورا کرنے کی فکر میں تمام عمر لگا رہتا ہے۔ اور جس قدر حیات انسانی دنیاوی بکھیڑوں اور مادی ــــ آلائشوں میں الجھتی جاتی ہے اسی قدر وہ خدا سے دور ہوتی جاتی ہے جس سے نجات حاصل کرنے کا مناسب و موزوں طریقہ بس یہی ہے کہ انسان کاروبار حیات اور خواہشات زندگی سے جس طرح ممکن ہو دستکش ہو جائے یا انہیں اس قدر کم کر دے کہ وہ نفس کا گیان حاصل کر سکے اور یہ گیان ہی

انسان کو روحانیت کے اس پُر نور راستہ پر لے آتا ہے جو روح انسانی کو اپنی تابانیوں اور کیف باریوں میں یزدان کی ابدی منزل تک پہنچا دیتا ہے اس لئے ویدانت کا سب سے بڑا مبلغ شنکراچاریہ روح کے علم کو ہی سب سے بڑا علم کہتا ہے۔

ویدانت کے ان افکار و اعتقادات کے برعکس اسلام کے نزدیک انسان نہ صرف مجبور محض ہے اور نہ کمال انسانیت کے لئے دنیا ترک کرنا یا علائق زندگی سے راہ فرار اختیار کرنا ضروری ہے اور نہ ہی روح انسانی ذات خداوندی میں جذب ہو کر امر ہو جاتی ہے۔ بلکہ اس کی تعلیم یہ ہے کہ انسان کو عقل و فکر کی وہ اعلےٰ صلاحیتیں اور ظاہری و باطنی قوتیں عطا کر دی گئی ہیں کہ اگر ان کی تربیت پیہم سعی و عمل اور مسلسل تگ و تاز سے صحیح خطوط پر ہونے لگے۔ تو اس میں صفاتِ خداوندی رونما ہونا شروع ہو جاتی ہیں اور جس قدر ان صفات میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ اسی قدر ایک انسان قربِ الٰہی حاصل کرتا چلا جاتا ہے۔ لیکن اس ذاتِ حقیقی میں کبھی جذب نہیں ہوتا۔

مسلمان کے نزدیک دین و دنیا دو نہیں ——— بلکہ ایک ہیں ——— دین میں جب خود غرضیاں شامل ہو جائیں ——— دین دنیا ہو جاتا ہے اور جب احکاماتِ الٰہیہ کا تتبع پیشِ نظر ہو تو دنیا دین ہو جاتی ہے اور ایک اچھا مسلمان وہی ہے جو نہ صرف اپنی تمام تر دنیاوی ذمہ داریوں کو مطابق رضائے الٰہی انجام دینا اپنا ایمان سمجھتا ہے بلکہ اپنے علم و عمل اور اخلاق و روحانیت سے دنیائے انسانیت میں ایسی قندیل روشن کر دیتا ہے۔ جس کی پر نور روشنی سے زندگی کی منزلوں میں خدمت خلق کا جذبہ بھی ابھرتا ہے اور کائنات کی گتھیوں کو سلجھانے کا حوصلہ بھی۔ اور یہی وہ صفات ہیں جن سے انسانی زندگی شادابیوں اور سرفرازیوں سے ہمکنار ہو جاتی ہے۔

خدا اور حیاتِ انسانی سے متعلق ہر دو نظریات کا کسی قدر جائزہ لینے کے بعد یہ بات بڑی حد تک واضح ہو جاتی ہے۔ کہ غالبؔ کے کلام سے جس خدا کا تصوّر ابھرتا ہے وہ کافی حد تک ویدانتی برہما سے ملتا جلتا ضرور ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ فلسفۂ ویدانیت کے یہ غیر اسلامی تصوّرات غالبؔ کی شاعری میں کس طرح اور کیونکر داخل ہو گئے۔؟

یہ بات تو اردو ادب کا ہر طالب علم بخوبی جانتا ہے کہ اردو شاعری کی ابتداء فارسی کے نقشِ قدم پر ہوئی ہے۔ اس لئے اس میں فارسی شاعری کی تمام اصناف مع اپنی خصوصیات، روایات اور بدعات کے ساتھ رائج ہو گئیں۔

غزل اصناف شاعری میں حسن و عشق کی کیفیات اور وارداتِ قلب و نظر کی ترجمانی کا بڑا ہی دلکش اور پر لطف ذریعہ رہی ہے حسن و عشق سے مراد حسنِ حقیقی اور عشقِ الٰہی کے بھی لئے جاتے رہے ہیں جسکی وجہ سے غزل کے مزاج میں رنگینی اور سرشاری کے ساتھ ساتھ محبّت اور عقیدت کے وہ راستے بھی رواں دواں نظر آتے ہیں جو ابدیت کی تلاش میں اکثر گم ہو جاتے ہیں۔

چنانچہ وحدۃ الوجود یا ہمہ اوست کا وہ صوفیانہ مسلک جو اردو شاعری میں عموماً اور غزل میں خصوصاً آج بھی رائج ہے۔ براہ راست ویدانت سے نہیں بلکہ عجمی شاعری سے منتقل ہوا ہے۔ اگرچہ تصوّف کی ابتداء تاریخ کے اوّلین دور سے شروع ہو جاتی ہے۔ اور یہ قریب قریب دنیا کی ہر قوم میں کسی نہ کسی رنگ روپ میں موجود رہا ہے۔ لیکن فلسفہ وحدۃ الوجود دراصل گوتم بدھ کے اس نظریہ قنوطیت کی آواز بازگشت ہے۔ جس نے چھٹی صدی عیسوی ق۔م اہل مشرق کے دل و دماغ میں یہ احساس پیدا کر دیا

تھا۔ کہ دنیاوی زندگی میں سوائے ناکامیوں، نامرادیوں اور نارسائیوں کے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ چنانچہ جوگیانہ اور راہبانہ زندگی کا یہ مسلک مشرق وسطیٰ کے ممالک تک ہی محدود نہ رہ سکا۔ بلکہ افلاطون کا شریکِ سفر ہو کر مغربی ممالک تک پہنچ گیا۔

افلاطون (Plato، ۴۲۷ تا ۳۹۹ء ق-م) اٹھائیس سال کی عمر میں ایتھنز سے بغرضِ سیر و سیاحت روانہ ہوا۔ بارہ برس تک مختلف ممالک میں گھومتا پھرا۔ اس عرصہ میں اس نے کئی ممالک کی تہذیبی، سماجی اور مذہبی زندگی کے اسباب و محرکات کا بھرپور جائزہ لیا۔ جن میں مصر اٹلی اور ہندوستان قابلِ ذکر ہیں ـــــ ہندوستان میں گنگ و جمن کا علاقہ ہمیشہ تہذیب و تمدن اور علوم و فنون کا گہوارہ رہا ہے۔ اس وقت بھی یہ علاقہ ویدانتی عقائد و نظریات کا مرکز تھا۔ چنانچہ افلاطون نے اپنے قیام کے دوران یہاں کی تہذیب و تمدن اور تصورات و عقائد کا گہرا مطالعہ کیا اور ویدانتی نظریہ زندگی اس کو اس قدر بھلا معلوم ہوا کہ وہ اسے اپنا سرمایۂ فکر و نظر بنا کر یونان لے گیا۔ اور وہاں پہنچ کر اپنے علم و حکمت اور قدرتِ اظہار و بیان سے اس نظریہ میں وہ تازگی اور شادابی بھر دی کہ یہ اہلِ مغرب کے تصورِ مذہب، فلسفہ، سائنس اور ادبیات کا لازمی جزو بن گیا اور ظہورِ اسلام تک قائم رہا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انسانی قوائے ذہن و عمل سہل انگاری، پاشکستگی اور یاسیت کا شکار ہو گئے۔

اسلام نے اس نظریہ کی پُر زور مخالفت کی اور انسان کو مسلسل جد و جہد اور عمل و حرکت کا پیغام دیا۔ لیکن آغاز سے سو ڈیڑھ سو سال بعد ہی دنیائے اسلام میں بھی مسلم صوفیا کا ایک ایسا گروہ پیدا ہو گیا جس نے تزکیہ نفس اور تصفیہ قلب کے پاکیزہ عمل کو وجہ جواز بنا کر سابقہ گوسفندی نظریہ حیات کی تعلیم تصوف کے نام سے دینا شروع

کردی جس کے خاطر خواہ نتائج سرزمین عجم میں برآمد ہوئے چنانچہ اسی تصوف کے گہرے اثرات عجمیوں کی زندگی ۔ فلسفہ اور ادب پر چھائے جس کے متعلق علامہ اقبال نے بھی اپنے ایک خط میں سید سلیمان ندوی مرحوم کو لکھا ہے ۔

" اس میں ذرا شک نہیں کہ تصوف کا وجود ہی سرزمین اسلام میں ایک اجنبی پودا ہے جس نے عجمیوں کی دماغی آب و ہوا میں پرورش پائی ہے "

اصناف شاعری میں صنف غزل ہی ایرانیوں کی سب سے زیادہ منظور نظر رہی ہے ۔ وہ اسی میں ہی انسان کے نظریات و خیالات اور اپنے دل کی دھڑکنوں کی عکاسی مختلف رنگوں سے کرتے رہے ہیں اس لئے اس میں ویدانتی تصوف کے وہ نقوش بھی ابھرے دکھائی دیتے ہیں جن کی ابتداء گوتم بدھ سے ہوئی تھی ۔

غالب نے جس دور میں آنکھ کھولی اس کی مقبول ترین صنف شاعری غزل تھی جس سے غالب کو فطری لگاؤ تھا ۔ اور فارسی کے ساتھ " ایک مناسبت ازلی اور سرمدی " فارسی سے اس قدر دلچسپی ، لگن اور لگاؤ کا مطالبہ یہی ہو سکتا تھا ۔ کہ غالب کی نگاہ فارسی گو شعراء کی جانب اٹھتی ۔ اور وہ ان کے کلام کا ژرف نگاہی اور باریک بینی کے ساتھ مطالعہ کرتے ۔ بلکہ اپنی شاعری میں ان شعرا کی روایتی اور مقررہ افکار و نظریات کا اظہار بھی کسی قدر اسی انداز میں کرتے جو اس وقت تک رائج و مقبول تھا ۔ تاکہ خود کو ان کے مد مقابل کھڑا کر سکتے اور اس میں شک بھی نہیں کہ غالب کا فارسی کلام جس قدر شگفتہ و شاداب اور رنگین و پر بہار ہے ۔ اس قدر اردو کا نہیں غالب خود بھی اپنی فارسی شاعری پر زیادہ ناز کرتے تھے ۔

— حالانکہ اردو میں بھی اپنی فکری تگ و تاز سے نئے راستے بنانے اور

تراشے تھے۔ اس لئے وہ صوفیانہ افکار و نظریات جو غالب کے کلام میں ملتے ہیں۔ ان کا تعلق روایت، غزل سے ضرور ہے لیکن دلی واردات سے ہرگز نہیں۔ اس خیال کی تائید متعدد بار غالب نے خود بھی کی ہے۔ کبھی کہتے ہیں۔

"بھائی میرے پاس کیا رکھا ہے البتہ شعر گوئی کی خاطر تھوڑا سا تصوّف اور نجوم لگا رکھا ہے"

کبھی کہتے ہیں۔

"تصوف برائے شعر گفتن خوب است"

اس کے علاوہ یہ بات بھی محل نظر ہے کہ غالب کے دور تک نظریہ وحدۃ الوجود کے تحت صوفیانہ افکار و نظریات کی جڑیں مسلم معاشرہ اور قومی زندگی میں اس قدر گہری پیوست ہو چکی تھیں کہ ان کا اثر براہ راست صدیوں سے ادب و فن پر پڑ رہا تھا۔ جس سے ایکا ایکی گریز کرنا غالب کے بس کی بات نہ تھی۔

پھر یہ بات بھی قابل فراموش نہیں ہے کہ ایک فنکار اپنے معاشرہ کی رسم و روایت سے کتنا ہی گریز کرے معاشرہ کی تہذیبی بو باس کا رچاؤ اور گردو پیش پھیلی ہوئی زندگی کی رمزیت فن پارہ سے ضرور جھانکتی نظر آتی ہے۔

وہ فن جس میں زندگی کی رمزیت اور بشارت موجود نہ ہو چاہے کتنا ہی جاذب نظر اور بظاہر بلند و بالا کیوں نہ ہو فن کہلانے کا مستحق نہیں کیونکہ ایسا فن زندگی کی تاریکیوں میں مشعل راہ کا کام نہیں دے سکتا۔ ان تمام محرکات، اسباب اور حالات کو نظر میں رکھا جائے تو یہی نتیجہ برآمد ہوتا ہے۔ کہ غالب کے کلام میں فلسفۂ وحدۃ الوجود کا اظہار روایتاً زیادہ ہے۔ اور عقیدتاً بہت کم۔

غالب کی زندگی پر نظر ڈالی جائے تو یہ حقیقت اور بھی کھل کر سامنے

آجاتی ہے کہ غالبؔ نہ ولی ہیں اور نہ صوفی ـــــ وہ ایک خواہش کے بعد دوسری خواہش کمانہ صرف تیزی سے پیچھا کرتے نظر آتے ہیں بلکہ جو خواہشیں تشنۂ تکمیل رہ جاتی ہیں ان کا ماتم بھی بڑی دلسوزی کے ساتھ کرتے ہیں۔ فقر و استغنا ان میں طبعاً نہ تھا۔

مذہب کی رسم و روایت کی بھی کبھی پرواہ نہ کی۔ کھانے کی فکر اور متاع و مرتبت کی حسرت غالبؔ کو تمام عمر رہی۔ اور اسی کے لئے وہ مسلسل ہاتھ پیر مارتے رہے مگر قابل ستائش یہ بات ہے کہ مادی نا آسودگی نے اگرچہ ان کی زندگی میں درد و غم بھر دیا تھا۔ لیکن اس درد اور درماندگی نے غالبؔ کے قوائے فکر و عمل پر مایوسی، پاشکستگی اور سہل انگاری کا کوئی نقش نہیں چھوڑا خود کہتے ہیں ؎

گھر میں تھا کیا کہ ترا غم اسے غارت کرتا
وہ جو رکھتے تھے ہم اک حسرت تعمیر سو ہے

غالبؔ کے ہاں وہ سکون اور زندگی کی ہماہمی سے فرار بھی نہیں ملتا جو صوفی کے لئے ضروری ہے۔ برخلاف اس کے غالبؔ مادی دنیا کی لطافتوں اور رنگینیوں سے پوری طرح لطف اندوز ہونے کی بے پناہ تمنا رکھتے ہیں اور ان سے دستکش ہونے کے لئے تیار نہیں ـــــ ان کی تمناؤں میں جان بھی ہے اور حوصلہ بھی ـــــ ذوق ہستی بھی موجود ہے اور حسرت گناہ بھی۔ وہ بزار مصائب دنیا سے خلوت گاہ میں بھاگ نہیں جاتے۔ مردانہ وار مقابلہ کرتے ہیں اور اپنے دل و دماغ کی صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر مظاہر فطرت اور اجزاء کائنات کا، جو معرفت الٰہی کا ذریعہ اور وسیلہ ہیں، گہرا مطالعہ کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ موجودات عالم سے بیگانہ وار نہیں گزر جاتے۔ وہ جانتے ہیں کہ کوئی شے بیکار نہیں۔ ہر شے ایک متعیّن مقصد رکھتی ہے جو ان کے لئے کسی نہ کسی پہلو سے نفع بخش ہو سکتی ہے۔

علامہ اقبال نے بھی کہا ہے۔

گل زار ہست و بود نہ بیگانہ وار دیکھ
ہے دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھ

اس نظریہ کو زیادہ موثر اور دل آویز انداز میں غالب نے یوں پیش کیا ہے ؎

یک ذرہ زمین نہیں بے کار باغ کا
یاں جادہ بھی فتیلہ ہے لالے کے داغ کا

٭

ساز یک ذرہ نہیں فیض چمن سے بیکار
سایۂ لالۂ بے داغ سویدائے بہار

٭

ہے رنگ لالہ و گل و نسریں جدا جدا
ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیئے

٭

یہاں یہ عرض کر دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ غالب روحانیت کے منکر نہیں۔ وہ اس کے تمام تصرفات پر ایمان رکھتے ہیں۔ یہ ضرور ہے وہ ایسی روحانیت کے قائل نہیں جو ان کو سینے کے چمن زار میں مقید کر دے اور وہ مراقبہ میں بیٹھے روز کائنات کے جلوے دیکھتے رہیں ——— ——— غالب اپنی ذات کی گہرائیوں سے باہر نکل کر حیات و کائنات کا مطالعہ عقل و حواس کی رفاقت میں کرنا انسان کے لئے ضروری سمجھتے ہیں اور اپنے افکار و نظریات کا تانا بانا مشاہدات، تجربات اور عقلی دلائل کو سامنے رکھ کر ترتیب دیتے ہیں وہ خدا کی تلاش بھی اسی دنیا میں کرتے ہیں جس میں ہم سب چلتے پھرتے، رہتے اور دیکھتے ہیں۔ لیکن یہ بات قابل ستائش ہے۔ کہ ان کی حیثیت اس ساری "تلاش و جستجو" میں فقط ایک

تماشائی کی سی رہتی ہے۔ خود تماشہ نہیں بن جاتے۔ نہ اپنی ہستی کو اس ذات حقیقی میں ضم کر دیتے ہیں۔

غالب کے تصور خدا کے ساتھ اُن کے دین و ایمان کی بات بھی چھڑ جاتی ہے۔ جس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ انسان کے اعتقادات اور نظریات کی ساخت پرداخت میں مذاہب کا بڑا دخل رہا ہے۔

غالب کا مذہب کیا تھا — یہ ایک علیحدہ بحث ہے اور اس پر کافی اختلاف رائے بھی موجود ہے لیکن یہاں اس قدر تحریر کر دینا برمحل ہوگا۔ کہ بعض اہل نظر کی رائے ہے۔ کہ غالب ماورا لنہری سنی العقیدہ خاندان میں پیدا ہوئے اور جب مرے تو سنیوں کی طرح دفن ہوئے۔ وہ سنی مسلمان تھے۔ کچھ کا خیال ہے[1] وہ زرتشتی عقائد میں دلچسپی رکھتے تھے۔ اور ان کے لوح ذہن پر ہرمزد نے مجوسیت کے جو نقوش چھوڑے تھے ان کی جلوہ گری اُن کے کلام میں نظر آتی ہے۔ بعض اس پر متفق ہیں کہ غالب کا مذہب شیعہ تھا ان کی تحریروں سے شدید قسم کی شیعت کا اظہار ہوتا ہے۔

کچھ یہ بھی کہتے ہیں غالب کا کوئی مذہب نہ تھا وہ لامذہب اور دہریہ تھے کچھ نے رافضی ہونے کا بھی لیبل لگایا۔ معلوم ہوتا ہے۔ کہ غالب کی زندگی میں ہی لوگوں نے اُن کے مذہبی عقائد کے متعلق مختلف نظریات قائم کر لئے تھے جن کی شہرت پر غالب کو یہ کہنا پڑا ؎

جن لوگوں کو ہے مجھ سے عداوت گہری
کہتے ہیں مجھے رافضی اور دُھریے
دہری کیونکر ہو، جو کہ ہو وے صوفی
شیعی کیونکر ہو ماوراء النہری

لیکن حقیقت یہ ہے کہ غالب مذاہب کی ظاہری رسم و روایت کے کبھی

---

[1] دل گداز ستمبر ۱۹۲۲ء۔ "غالب کی شاعری" مصنفہ مرزا محمد عسکری

قائل نہ رہے ازلی حقیقت کی تلاش اور جستجو کو مقصد حیات سمجھا اور اپنے مذہبی عقائد و نظریات کے متعلق ایک بار نہیں کئی بار لکھا اور کہا۔ کہ وہ موحد خالص ہیں اور ساری انسانیت ان کی برادری، جو ایک ہی نور کامل سے فیض حاصل کرتی ہے ــــــ

اس طرح غالبؔ کا اصل دین خدائے واحد کی پرستش ہے اور ایمان صرف انسان دوستی۔

❁

غالبؔ کا سماجی شعور[1]

انسان جس زمانے اور جس ماحول میں آنکھ کھولتا ہے اس کے اثرات قبول کرتا ہے یہ ضرور ہے کبھی کم اور کبھی زیادہ۔ اثر کی اس کمی بیشی کا انحصار عام طور پر ہر شخص کی اپنی قوّت احساس اور واقعات وحالات کی نوعیت پر ہوتا ہے — جس قدر کسی شخص کے فہم وادراک میں رفعت، احساس میں شدّت، واقعات وحالات کو گرفت میں لینے کی صلاحیت اور نظریاتی اصابت موجود ہوتی ہے اسی قدر واضح اور نمایاں نقوش اس کے ذہن ومزاج پر ابھرتے ہیں لیکن ان نقوش میں زندگی اس وقت تک پیدا نہیں ہوتی جب تک زبان وبیان میں تاثیر کی روح نہ پھونکی جائے۔ یہ مسیحائی ہر شخص کے بس کی بات نہیں — ایک اچھا اور بڑا فنکار ہی یہ فریضہ بطریق احسن انجام دے سکتا ہے۔

غالبؔ بھی ایک فنکار ہے مگر اس وقت دیکھنا یہ ہے۔ کہ اس نے اپنے سماج کی کس حد تک نمائندگی کی ہے۔ اور کس انداز میں کی ہے۔ کیا کچھ اس نے معاشرہ کو دیا ہے اور کیا کچھ اس سے لیا ہے۔

جب ہم غالبؔ کے سماجی شعور کا تجزیہ کرتے ہیں تو بحث کے دو انداز واضح طور پر سامنے آتے ہیں — ایک وہ جس میں غالب کو ایک سرسری اور عام نگاہ سے دیکھنے پر اکتفا کیا گیا ہے۔ اور دقّت نظر سے کام نہیں لیا گیا دوسرا وہ جس میں غالبؔ کی ہمہ جہت شخصیت پر خلوص فکر کے ساتھ بحث کی گئی ہے۔ ان ہی فکری انداز کی رو اور روش سے متاثر ہو کر ایک قاری

---

[1] صحیفہ - جنوری ۱۹۷۱ء

بعض وقت کچھ یوں محسوس کرتا ہے جیسے اسکے سامنے دو غالب ہیں۔

ایک غالب وہ ہے جو شرابی ہے۔ جواری ہے۔ جس نے اپنے گھر پر جوے کا اڈہ قائم کیا اور چھ ماہ قید با مشقت کی سزا پائی ـــــ جو ایک "ستم پیشہ ڈومنی" کی زلفِ گرہ گیر کا اسیر رہا جس نے اپنی نوابانہ زندگی کے ٹھاٹ باٹ کو قائم و برقرار رکھنے کے لئے مہاجنوں سے قرض لئے۔ جس پر قرض خواہوں نے ڈگریاں کرائیں۔ جس نے اپنی بڑی حویلی لکشمی چند سیٹھ کو بیچ دی۔ اور خود ساری عمر کرایہ کے مکانات میں رہائش پذیر رہا۔ جس نے قصیدہ لکھ کر دستِ طلب دراز کیا ـــــ وہ جو خود غرض اور موقع پرست ہے۔ جس نے مفتی صدر الدین آزردہ کی بیوہ کی مالی امداد کو خود لینا چاہا۔ وہ جو قدّامت پسند ہے۔ طرزِ بیدل کا پرستار رہا ہے اور اپنی فارسی دانی اور کلام فارسی پر اس قدر نازاں ہے کہ ہند کے کسی دوسرے شاعر کو اپنا ہمسر نہیں سمجھتا اور ہندوستان میں رہتے ہوئے تیغ اصفہانی کا گھائل ہے اور اپنے کلام اردو کو "بے رنگ" سمجھتا ہے۔ جو عام وضع قطع اور لباس کو اپنی برتری اور شان کے منافی سمجھتا ہے۔ حتّیٰ کہ عام وبا میں مرنا بھی پسند نہیں کرتا ـــــ

دوسرا غالب وہ ہے جو ریاکار نہیں ہے۔ جو راست گفتار بھی ہے اور دیانت دار بھی، جو خوشامد پسند نہیں کرتا۔ جس میں پاسِ وضع بھی ہے اور نگاہ کرم بھی ـــــ جو نفاست پسند ہے۔ جس میں خوش مذاقی بھی ہے اور خوش مزاجی بھی ـــــ جو خود دار ہے جسے اپنی عزتِ نفس کا بھی خیال ہے۔ اور دوسروں کی عزت کا بھی ـــــ جو اپنی اردو طرزِ تحریر پر نازاں بھی ہے اور دلی کا پرستار بھی ـــــ جس نے شراب ضرور پی ہے لیکن "نشاط" کی غرض سے نہیں۔

اس میں شک نہیں کہ غالب کی شخصیت بڑی رنگا رنگ اور پہلو دار ہے اور اس کو صحیح طور پر جاننے اور سمجھنے کے لئے غالب کے پس منظر اور ان حالات

کا بغور جائزہ لینا ہوگا جن کے اثر نے اُسے ایک نئی سوچ اور ایک خاص شعور بخشا اور وہ محرومیاں اور نامرادیاں جن کے درد نے اس کی فکر و نظر کو ایک نیا اعجاز، نئی بصیرت اور نیا سلیقہ عطا کیا ـــــ انہی سوچ اور درد سے جس کی جڑیں سماج کی گہرائی میں پیوست ہوتی ہیں سماجی شعور ابھرتا ہے۔

غالبؔ سلجوقی النسل ترک تھے۔ وہ ۲۱ دسمبر ۱۷۹۷ء کو ایک کھاتے پیتے گھرانے میں پیدا ہوئے۔ اس لئے ان کے مزاج میں جہاں برتری انفرادیت اور شہرت کا جذبہ ابھرا وہاں وہ علتیں اور عادتیں بھی پیچھے لگ گئیں جو ایک امیرانہ ماحول کی رسم و رواج سمجھی جاتی ہیں

دوسری وجہ غالبؔ کی اس رنگین زندگی کے قائم رہنے کی یہ بھی ہوتی کہ بچپن ہی میں والد اور چچا کا سایہ ان کے سر سے اٹھ گیا اور خاصی نگہداشت نہ ہو سکی۔

چنانچہ غالبؔ بچپن ہی سے اچھا کھانے۔ اچھا پہننے، پینے پلانے اور عیش و تکلف کے عادی ہو گئے۔ شاہد بازاری کا عشق بھی دامن گیر ہوا چنانچہ خود اپنی ابتدائی زندگی کے متعلق لکھتے ہیں۔

"میں نے ایام دبستاں نشینی میں "شرح مائۃ عامل" تک پڑھا بعد اس کے لہو و لعب اور آگے بڑھ کر فسق و فجور، عیش و عشرت میں منہمک ہو گیا۔"

مگر یہ سکھ چین زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہا۔ عالم شباب تک پہنچتے پہنچتے وہ وسائل اور ذرائع جو نوابانہ زندگی کو برقرار رکھنے کے لئے ضروری ہوتے ہیں ایک ایک کر کے ختم ہوتے چلے گئے۔ لیکن وہ بری عادتیں جو اس زندگی کی دین تھیں انہیں غالبؔ نہ چھوڑ سکے۔ جس کی وجہ سے بڑی حد تک ان کی زندگی پُر درد، بے چین اور پریشان ہو گئی۔ اور یہ غالبؔ کی زندگی کا وہ مقام ہے جہاں "غم ہستی" کا کوئی علاج "جز مرگ" نظر نہیں آتا۔ مگر اجل کا آنا بھی تو انسان کے بس کی بات نہیں۔ کہ

جب چاہا۔ اور جہاں چاہا موت آگئی۔

اس کا بھی تو ایک وقت اور ایک دن معیّن ہے " جب تک تو غالب کو زندگی گزارنا ہی تھی ۔ پھر بہر طور ۔ بہر نوع اور بہر حال نہیں بلکہ اسی ڈھب پر جیسی گزر چلی تھی۔ چنانچہ انہوں نے جوئے کا اڈہ بھی قائم کیا اور ساہوکاروں سے قرض بھی لئے ۔

لیکن —— یہ ضرور ہے کہ قرض ادا کرنے کا خیال برابر رہا بلکہ اس کی ادائیگی کے لئے ہر وقت کوشش میں لگے رہے۔ اور ایک وقت جب ادائیگی قرض کا کوئی فوری ذریعہ میسّر نہ آسکا۔ تو بڑے دل گرفتہ اور مضطرب ہوئے اور خود پر شدید طنز بھی کیا۔ جس میں قرض کے بروقت ادا نہ ہونے کا شدید کرب بھی موجود ہے۔ اور عزت نفس کے مجروح ہونے کا خیال بھی ۔

ملاحظہ ہو۔

" لے اب تو قرضداروں کو جواب دے سچ تو یوں ہے کہ غالب کیا مرا بڑا ملحد مرا —— بڑا کافر مرا —— ہم نے ازراہ تعظیم جیسا بادشاہوں کو بعد ان کے جنت آرام گاہ وعرش نشین خطاب دیتے ہیں۔ چونکہ یہ اپنے کو شاہ قلمرو سخن جانتا تھا۔ سقر مقر اور ہاویہ زاویہ خطاب تجویز کر رکھا ہے آیئے نجم الدولہ بہادر ایک قرضدار کا گریبان میں ہاتھ —— ایک قرضدار بھوگ سنا رہا ہے۔ میں اُن سے پوچھ رہا ہوں ۔ اجی حضرت نواب صاحب —— نواب صاحب کیسے —— اوغلان صاحب —— آپ سلجوقی اور افراسیابی ہیں۔ یہ کیا بے حرمتی ہو رہی ہے کچھ تو اکسو ، کچھ تو بولو —— بولے کیا —— بے حیا۔ بے غیرت ۔ کوٹھی سے شراب گندھی سے گلاب ۔ بزاز سے کپڑا ، میوہ فروش سے آم ۔ صراف سے دام قرض لئے جاتا ہے۔ یہ بھی تو سوچا ہوتا کہاں سے دوں گا۔ "

غزل میں بھی اس احساس کا اظہار اس طرح کیا ہے ؎

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائیگی ہماری فاقہ مستی ایک دن

جوئے کی بدولت غالبؔ پر جو اسیری کی مصیبت آئی اور جو ان کی بے عزتی کا سبب بنی اس کا اثر بھی غالبؔ کی طبع نازک پر شدید اور گہرا تھا۔ جس کا اندازہ ان کی فارسی نظم "حبسیہ" اور ان کی تحریر سے ہوتا ہے۔

"میری یہ آرزو ہے کہ اب دنیا میں نہ رہوں —— اور اگر رہوں تو ہندوستان میں نہ رہوں — مصر ہے — ایران ہے — بغداد ہے۔ یہ بھی جانے دو خود کعبہ آزادوں کی جائے پناہ اور آستانہ رحمۃ اللعالمین دلدادوں کی تکیہ گاہ ہے دیکھئے وہ وقت کب آئے گا کہ درماندگی کی قید سے جو اس گزری ہوئی قید سے زیادہ جانفرسا ہے۔ نجات پاؤں اور بغیر اس کے کوئی منزل مقصود قرار دوں سر بہ صحرا نکل جاؤں —"

وہ شراب جو عالم شباب تک غالبؔ کے لئے "آب نشاط انگیز" تھی اب وجہ نشاط نہ رہی تھی۔ بلکہ کچھ دیر کے لئے غم و آلام سے چھٹکارا پانے کا محض ایک ذریعہ ——

لیکن غالبؔ نے ہمیشہ شراب کو برا ہی سمجھا اور خود کو "گناہ گار" روسیاہ اور "بندہ کمینہ" آخرت کی فکر بھی اسی لئے زیادہ تھی ایک خط میں مولوی عبدالغفور خان نساخ کو لکھتے ہیں۔

"روز و شب یہ فکر رہتی ہے کہ دیکھئے وہاں کیا پیش آتا ہے اور یہ بال بال گنہگار بندہ کیونکر بخشا جاتا ہے"

ایک خط میں میاں سیف الحق سیاح کو لکھتے ہیں

"بڑا سفر دور دراز درپیش ہے —— زادراہ موجود نہیں —— خالی ہاتھ جاتا ہوں اگر ناپرسیدہ بخش دیا تو خیر —— اگر بازپرس ہوئی تو سقر مقر ہے اور ہاویہ زاویہ ہے۔ دوزخ جاوید ہے اور ہم ہیں —"

مگر یہ بات قابل داد اور لائق ستائش ہے کہ غالبؔ شراب پی کر بھی

رند باہوش نظر آتے ہیں ـــــ ڈگمگاتے نہیں ـــــ بہک نہیں جاتے اور اپنا وہ مذہبی اور اخلاقی ورثہ جو برسوں پھیلی ہوئی اسلامی تہذیب کا ایک دفتر ہے۔ اسے دفتر "بے معنی" کہہ کر "غرق مئے ناب" نہیں کرتے۔ یہ درست ہے کہ غالب عملاً متقی اور پرہیز گار نہیں تھے۔ روزہ اور نماز کے بھی پابند نہ تھے جس کا احساس انہیں خود بھی تھا۔

نثر کے علاوہ نظم میں بھی اس کا اظہار کیا ہے۔

لافِ دانش غلط و نفعِ عبادت معلوم
دردِ یک ساغرِ غفلت ہے چہ دنیا وچہ دیں
بیدلیہائے تماشا کہ نہ عبرت ہے نہ ذوق
بیکسی ہائے تمنا کہ نہ دنیا ہے نہ دین

اس کے باوجود غالب کو اسلام اور مسلمان سے شیفتگی اور عشق تھا وہ مقام کبریا سے بھی بخوبی آشنا تھے۔ اور ربّ محمدؐ سے بھی۔ وہ روز حشر پر بھی ایمان رکھتے تھے اور سزا و جزاء پر بھی۔

بزرگانِ دین اور مقاماتِ مقدسہ کا جہاں کہیں نام آیا ہے بڑے احترام اور عقیدت مندی کے ساتھ لیا ہے۔ غالب ایک خط میں جو علاؤالدین خاں علائی کو لکھا ہے۔

اپنے مذہبی عقائد کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"میں موحد خالص ہوں اور مومن کامل ہوں ـــــ زبان سے لاالہ الاّ اللہ کہتا ہوں اور دل سے لا موجود الا اللہ اور لا موثر فی الموجود الا اللہ سمجھے ہوں۔ انبیاء سب واجب التعظیم .... محمدؐ علیہ السلام پر نبوت ختم ہوئی یہ ختم المرسلین اور رحمتہ اللعالمین ہیں ـــــ"

اس کے علاوہ وہ مثنوی جو غالب نے وہابیت کے خلاف سرور کائنات کے متعلق مولوی فضل حق خیر آبادی کے اصرار پر تحریر کی۔ وہ نذرانہ لغت جو بارگاہ رسالت مآب میں پیش کیا۔ جس کا آخری شعر ہے ؎

غالبؔ ثنائے خواجہ بہ یزداں گزاشتیم
کاں ذات پاک مرتبہ دانِ محمدؐ است

اور اسی طرح مثنوی " ابر گہر بار " میں خداوند برتر کے حضور حمد و مناجات کا ایک حسین اور دل آویز ارمغان پیش کیا ہے۔ جو رفعت تخیل اور بلندی فن کا بہترین نمونہ ہے اور غالبؔ کا خیال حمد و مناجات میں اس منزل پر پہنچ جاتا ہے جہاں تک پہنچنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں ۔ بلکہ غالبؔ تو بندگی اور پختگی ایمان کے لئے کسی لالچ اور ڈر کو بھی گوارا نہیں کرتے ــــــ اپنے اس خیال کا اظہار اس طرح کیا ہے۔

طاعت میں تا رہے نہ مئے وانگبین کی لاگ
دوزخ میں ڈالدے کوئی لاکر بہشت کو !

اس کے علاوہ بھی ان کی شاعری اور نثر میں جا بجا مذہبی خیالات کا اظہار اس امر کی دلیل ہے کہ غالبؔ راسخ العقیدہ مسلمان تھے۔

غالبؔ فطرتاً خوشامد پسند نہیں تھے انہوں نے قصائد اس لئے نہیں لکھے کہ محض خوشامد کی جائے۔ بلکہ اس لئے کہ اس وقت درباروں میں اس ادبی صنف کا عام رواج تھا اور اس میں اپنے جوہر علم و فن دکھانا بھی شاعر کی قادر الکلامی اور تبحر علمی کا ایک ثبوت سمجھا جاتا تھا۔

بادشاہ خود بھی علم دوست ہوتے تھے یا شاعر ــــــ جو فن شاعری کی قدر بھی کرنا جانتے تھے اور شاعروں کی سرپرستی بھی۔ یہی صنفِ شاعری اس وقت ایسی تھی جس کے ذریعہ ہر شاعر اپنے کمال فن کی داد محض توصیفی الفاظ میں نہیں بلکہ نقد نذرانہ کی صورت میں وصول کرنا چاہتا تھا۔ غالبؔ بھی ایک انسان تھے انہیں بھی زندگی بسر کرنا تھی اور زندگی کے لئے اسباب زندگی مہیا کرنا تھے۔ ان حالات میں اس دور کی روایتی صنفِ شاعری میں نوابین اور رؤسا کی مدحت سرائی سے ان کا مقصد محض اپنا حق شعر گوئی طلب کرنا تھا خوشامد کرنا نہیں تھا

پھر غالب تو ویسے بھی بڑی محتاط طبیعت رکھتے تھے۔ اپنی عظمت اور برتری کا انہیں ہر وقت خیال رہتا تھا وہ قصیدوں میں "بھاٹوں کی طرح بکنا" کس طرح پسند کر سکتے تھے۔ اپنی اس روش کی نسبت خود تفتہ کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"وہ روش ہندوستانی فارسی لکھنے والوں کی مجھکو نہیں آئی کہ بالکل بھاٹوں کی طرح بکنا شروع کر دیں

میرے قصیدے دیکھو۔ تشبیب کے شعر بہت پاؤ گے۔ مدح کے شعر کمتر۔ نثر میں بھی یہی حال ہے۔"

ایک خط میں مولوی عبدالغفور خاں نساخ کو لکھتے ہیں

"میں دروغ گو نہیں۔ خوشامد میری خو نہیں۔"

غالب مالی مشکلات کے باوجود وہ کام کرنا ہرگز پسند نہیں کرتے تھے جس میں ان کی عزت نفس اور وضعداری پر کوئی زد پڑتی ہو۔

غالب نے دوران سفر کلکتہ اس خیال سے لکھنؤ زیادہ قیام کیا تھا کہ وہاں کے دربار سے انہیں خاصی رقم ملنے کی توقع تھی وہ زمانہ ان کی تنگ دستی کا تھا۔ اور اپنی خاندانی پنشن کی بحالی کے لئے سفر پر نکلتے تھے مگر وہ دربار داری کے ادب و آداب کے مطابق نہ تو بادشاہ لکھنؤ کو نذر پیش کرنے کے لئے تیار ہوئے اور نہ وزیر اعظم آغا میر کو تعظیم کے لئے

جس کی وجہ سے نہ ہی بادشاہ سے ملاقات ہو سکی اور نہ رقم مل سکی۔ ایک مرتبہ معاشی حالت زیادہ خراب ہوئی تو غالب کو ملازمت کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ سنہ ۱۸۴۳ء میں دلی کالج میں ایک آسامی فارسی معلم کی خالی تھی غالب اس ملازمت کیلئے کالج پہنچے۔ لیکن ان کی وہاں تعظیم نہ کی گئی۔

غالب نے مسٹر ٹامسن سے اس رویہ کی شکایت کی جس پر انہوں نے کہا کہ وہ ملازمت کی غرض سے کالج آئے ہیں نہ کہ رسمی ملاقات کے لئے۔ ایک ملازم یا ملازمت کے خواستگار کے لئے تعظیم کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اس پر غالب

وہاں سے یہ کہہ کر واپس ہوئے کہ میں نے تو سوچا تھا کہ ملازمت سے عزت و وقار میں اضافہ ہوگا۔ یہ نہ معلوم تھا کہ اس سے رہی سہی عزت بھی کم ہو جائے گی۔

غالب کو نوابانِ رامپور کا مہمان ہونا بھی اس لئے گوارا تھا کہ وہ ان کا بڑا خیال رکھتے تھے ان کو نوکر نہیں بلکہ دوست گردانتے تھے۔

ایک خط میں یوسف مرزا کو لکھتے ہیں

" نواب صاحب۔ دوستانہ وشاگردانہ دیتے ہیں ــــ مجھ کو نوکر نہیں سمجھتے ملاقات بھی دوستانہ رہی۔ معانقہ وتعظیم جس طرح احباب میں رسم ہے وہ صورت ملاقات کی ہے "

مگر غالب کے کردار کی یہ بڑی خوبی ہے کہ اس نے اپنے اعمال اور نظریات پر تکلّف اور ریاکاری کے دبیز پردے نہیں ڈالے جس سے اس کی شخصیت کا ہر پہلو اجاگر ہو جاتا ہے۔ اور وہ ہمارے سامنے ایک انسان ہی کی طرح ابھرتا ہے ــــ نہ فرشتہ کی طرح جو سراپا نیکی ہو۔ اور نہ شیطان جو سرتاپا بدی ــــ بلکہ وہ انسان جس میں اعلےٰ ظرفی اور انسان دوستی کے ساتھ ساتھ شراب نوشی کی عادت بھی ملتی ہے۔ اور عشق و عاشقی کا تذکرہ بھی، قرض لینے کی مجبوریاں بھی ملتی ہیں اور مذہبی شدّت پسندی سے نفرت بھی،

غالب پر ایک الزام یہ بھی عائد کیا جاتا ہے کہ وہ خود غرض اور موقع پرست تھے۔ اور اس الزام کی دلیل میں بیوہ صدرالدین آزردہ کی اس امداد کا حوالہ دیا جاتا ہے جس کے بارے میں بعض معترضین کو شکایت ہے کہ غالب نے نواب رامپور کو یہ خط لکھا کہ بیوہ صدرالدین آزردہ مالی امداد کی مستحق نہیں ہیں مگر یہ اعتراض درست نہیں ہے

غالب نے اپنی تحریر میں اس مالی امداد حوالہ کو بطور نظر پیش کیا ہے۔ کہ نواب رامپور ان کی سقیم اور کمزور حالت سے بخوبی واقف

ہو سکیں اور اہنیں. بیوہ آزردہ سے کہیں زیادہ مالی امداد کا مستحق سمجھ لیا جائے مگر غالبؔ نے اپنے خط میں نہ تو یہ لکھا کہ بیوہ آزردہ کو غلط امداد دی گئی ہے اور نہ یہ کہ وہ اس کی مستحق نہ تھیں۔

غالبؔ کی نظر اُن کی ابتدائی دور کی شاعری میں کئی فارسی گو ہندوستانی شعراء پر پڑی مگر جہاں تھوڑے عرصہ کے لئے ٹھہری وہ بیدلؔ تھے۔ مرزا عبدالقادر بیدلؔ۔ غالبؔ سے قبل کے فارسی گو شعراء میں اپنی ذہانت، قابلیت اور قلندرانہ عجز کی وجہ سے ایک خاص مقام رکھتے تھے۔

غالبؔ کو بیدلؔ کا انداز شاعری پسند آیا اور اسے اپنی طبیعت اور مزاج کے مطابق پایا۔ اس لئے خود کو اس انداز اور اس ڈگر پر ڈالنے کی کوشش کی اور ایک عرصہ کے لئے خود کو گمراہی کے خوف سے محفوظ کر لیا ؎

مجھے راہ سخن میں خوف گمراہی نہیں غالبؔ
عصائے خضر صحرائے سخن ہے نامہ بیدلؔ کا

جب غالبؔ نے اپنی جدت طبع سے فارسی دلبستان شاعری میں "نقش ہائے رنگ رنگ" بکھیر دیئے اس وقت شاہان مغلیہ کا دور حکومت ختم ہو چکا تھا اور فارسی زباندانی کی قدر کم ہوتی جارہی تھی اس لئے غالبؔ کو یہ شدید احساس تھا کہ نیرنگئی خیال اور ندرت بیان کے وہ گنج ہائے گرانمایہ جو انہوں نے بڑی جانکاہی اور دل سوزی سے جمع کئے ہیں ان کی بدلتے ہوئے سماج میں کوئی قدر و قیمت نہ ہوگی اس لئے وہ "گلستان عجم" کی طرف نظر ڈالتے دکھائی دیتے ہیں اور یہ خیال ان کی زبان قلم سے ادا ہو جاتا ہے ؎

بود غالبؔ عندلیبے از گلستانِ عجم
من زِ غفلت طوطئ ہندوستان نامیدمش

اور اس میں شک بھی نہیں کہ جس قدر غالبؔ کو اپنی فارسی شاعری پر ناز تھا۔ اس قدر اردو کلام پر نہ تھا۔ کیونکہ غالبؔ نے اسے سنوارنے اور نکھارنے میں بڑی محنت اور دیدہ ریزی سے کام لیا تھا یہ اور بات ہے

کہ غالب کے کلام کو وہ مقبولیت اور شہرت حاصل نہ ہو سکی جو ان کے اردو کلام کو ہوئی۔

مگر چند سال بعد غالب نے یہ محسوس کیا کہ ان کی شاعری میں خیال بندی اور لفظی صنعت گری سے ایک ابہام، ایک تکلف اور ایک الجھاؤ پیدا ہو گیا ہے۔ جو شاعری کے مزاج کو حقیقت پسندی سے دور لئے جا رہا ہے اور اس وحدۃ الوجود کے عقیدے نے جو اس وقت تک کی شاعری میں عموماً اور بیدل کی شاعری میں خصوصاً ادبی روایت بن چکا تھا معاشرہ کی سماجی اور اخلاقی زندگی میں سست روی اور شکست خوردگی کا شدید احساس پیدا کر دیا ہے۔

چنانچہ غالب جو رواں دواں اور متحرک ذہن و مزاج کے مالک تھے اس گھٹن اور ٹھہراؤ کو کب تک گوارا کرتے۔ ان کی جدت پسند طبیعت نے ادبی رسم و روایت سے ہٹ کر اپنی شاعری میں ایک ایسی نئی سادہ اور پرکشش راہ اختیار کی جس میں حقیقت کا ادراک بھی ہے اور فرد کا احترام بھی —— خیالات میں شگفتگی بھی ہے اور انداز میں تازگی بھی —— مگر اس کے باوجود یہ بات اپنی جگہ مسلّم ہے کہ غالب کی اردو شاعری اس قدر آسان اور سادہ نہ ہو سکی جس قدر ان کی اردو نثر ہے اور یہ نثر ان خطوط پر مشتمل ہے۔ جو غالب نے وقتاً فوقتاً اپنے مختلف دوست احباب کو لکھے ہیں جن کے طرز تحریر کے بارے میں وہ خود لکھتے ہیں

"میں نے وہ انداز تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا ہے ہزار کوس سے بزبان قلم باتیں کیا کرو —— ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو"

ایک جگہ اور اس خیال کا اظہار اس طرح کیا ہے۔

"پیر و مرشد یہ خط لکھنا نہیں ہے — باتیں کرنی ہیں —— اور یہی سبب ہے کہ میں القاب و آداب نہیں لکھتا ——"

اور حالی کی یہ رائے بھی اپنی جگہ بڑی مناسب اور درست ہے۔

" مرزا کی عام شہرت جس قدر اُن کے اُردو نثر کی اشاعت سے ہوئی ــــ ویسی نظم اردو اور فارسی سے نہیں ہوئی۔"

بعض ناقدین کی یہ رائے ہے کہ غالبؔ کا اردو شعر و ادب میں بیان کی سادگی اور صفائی کا رجحان اُن کے سفر کلکتہ کا مرہون احسان ہے۔ مگر یہ رائے اس لئے سمجھ میں نہیں آتی کہ غالبؔ کے سفر کلکتہ اور اُن کی سادگی پسندی کے درمیان تقریباً اکیس ۲۱ بائیس سال کا طویل فاصلہ موجود ہے۔ اس میں شک نہیں کہ جب ۱۸۲۸ء میں غالبؔ کلکتہ پہنچے اس سے کئی سال قبل کلکتہ ڈاکٹر گلکرسٹ کی سیاسی مصلحت کے پیش نظر اردو کا دارالترجمہ بن چکا تھا۔ اور ۱۸۲۰ء تک فارسی اور ہندی زبان کے کئی مضامین اور کتابوں کا ترجمہ میر امن۔ سید حید بخش حیدری میر شیر علی افسوس۔ میر بہادر علی حسینی۔ مرزا جان طپش اور نہال چند وغیرہ کی علمی اور ادبی کوششوں سے سلیس اردو میں ہو کر چھپ چکا تھا ــــ ــــ اس طرح اردو زبان میں علم و ادب کا ایک بڑا ذخیرہ افسانوں۔ کہانیوں تذکروں اور مضامین میں علم فقہ۔ اخلاق اور صرف نحو وغیرہ کا پہلی بار جمع ہو گیا تھا۔ جس سے ایک ذی علم۔ حساس اور جدت پسند شخص کا متاثر ہونا ممکن تھا مگر غالبؔ کے فن شعر و ادب میں دوران قیام کلکتہ یا وہاں سے واپسی پر شاعری میں سادگی پسندی اور اردو ادب سے زیادہ دلچسپی کا رجحان نظر نہیں آتا۔ بلکہ غالبؔ دورانِ قیام کلکتہ وہاں کے مشاعروں اور ادبی محفلوں میں شریک ہوئے اور وہاں کے خوش ذوق اہل علم نے غالبؔ کے فارسی کلام و زبان کی بیحد تعریف کی جس پر کلکتہ کے شعرا کو اپنی فکری کم مایگی اور نظری پسماندگی کا احساس ہونے لگا۔ جس کے نتیجہ میں انہوں نے غالب کے خلاف ایک ادبی محاذ قائم کر دیا اور مجبوراً غالب کو اپنی گلو خلاصی کے لئے اس وقت فارسی زبان میں ہی مثنوی باد مخالف" لکھنا پڑی

غالبؔ کے شعر و ادب میں سادگی پسندی اور اردو زبان کی طرف زیادہ متوجہ ہونے کا رجحان غدر سے سات آٹھ سال پہلے ہی ملتا ہے جبکہ وہ

۱۸۵۰ء میں خاندان تیموریہ کی تاریخ لکھنے کی خدمت پر مامور کئے گئے اور یہ محض وقتی حالات اور سیاسی تقاضوں کا نتیجہ تھا۔

دہلی پر انگریزوں کا قبضہ ۱۸۰۳ء میں ہو چکا تھا۔ جس کی وجہ سے شہنشاہ اور شہزادوں کی نہ صرف سیاسی زندگی ختم ہو گئی تھی۔ بلکہ ان کی ادبی اور معاشی زندگی بھی بڑی حد تک مفلوج ہو گئی تھی اور اسی وجہ سے فارسی زبان جو محض درباری اور پڑھے لکھے لوگوں کی زبان تھی۔ اپنی قدر و منزلت روز بروز کھوتی جا رہی تھی۔ اور اردو جو عوام کی اور معاشرہ کی زبان تھی روز بروز ترقی کر رہی تھی۔ بلکہ اُن دنوں جو مشاعرے قلعہ معلّٰی میں ہوتے تھے اُن میں بہادر شاہ ظفر اور شہزادے وغیرہ خود بھی اردو میں غزل کہتے تھے۔

اُردو کی ترقی کی بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ انگریز اس کی پشت پناہی کر رہا تھا۔ جو اپنی حکومت کے استحکام کے لئے عوام سے قریب تر آنا چاہتا تھا اور اس قربت کے لئے یہ ضروری تھا کہ وہ عوام کی زبان سیکھے۔ اور اس زبان کو سیکھنے کے لئے ہی اس نے فورٹ ولیم کالج میں کئی فارسی اور ہندی زبان کی کتابوں کا ترجمہ کرایا۔ اور پریس قائم کیا اس کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ ۱۸۰۰ء سے قبل نہ تو اردو زبان میں کوئی قابل قدر کتاب موجود تھی اور نہ اردو کا پریس تھا۔

اس کے علاوہ اس وقت اردو کی مقبولیّت کی یہ وجہ بھی ہوئی کہ اردو کے کئی پریس ہندوستان میں قائم ہو گئے تھے۔ جن کی بدولت متعدد اخبارات کی اشاعت بھی شروع ہو گئی خود دہلی میں مولوی محمد باقر نے ایک ہفت روزہ اخبار موسومہ "اردو اخبار" ۱۸۳۶ء میں جاری کر دیا تھا جو ۱۸۵۷ء تک بڑی کامیابی اور باقاعدگی سے شائع ہوتا رہا۔

اردو کی اس مقبولیت کا اثر غالبؔ کے ذہن و مزاج پر قدرتاً ہونا ضروری تھا۔ یہی اسباب زیادہ قرین قیاس ہیں جو غالب کو سادگی پسندی اور عوام کی زبان یعنی اُردو سے زیادہ قریب لے آئے۔

غالب کے سماجی شعور کو سنوارنے اور نکھارنے میں اس بخت نارسا کا بھی بڑا ہاتھ ہے جس نے اُن کی زندگی کو آخر دم تک مسلسل بے چین اور ناہموار رکھا۔ زندگی کی اس ناہمواریت نے غالبؔ کو ایک احساس اور ایک نیا ادراک بخشا جو زندگی کو نئے طریقے اور نئے زاویئے سے دیکھنے پرکھنے کا سبب بنا۔ اگر غالب کی تمام ضروریات اور خواہشات خود بخود پوری ہوتی رہتیں تو ان کی زندگی بالکل سپاٹ اور پھیکی ہو کر رہ جاتی اس میں کوئی کشش باقی نہیں رہتی زندگی میں جدّوجہد اور ہلچل اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب ہزاروں خواہشیں تشنۂ تکمیل رہیں ـــــ بہت سے ارمان پورے نہ ہوں اور کل کا پتہ نہ ہو غالب کی بحالی پنشن کی تگ ودو سفر کلکتہ اور دیگر کئی شہروں کے قیام کا باعث بنی ـــــ یہ ضرور ہے کہ اس سفر سے غالب کی مالی مشکلات اور معاشی الجھنوں میں کوئی کمی واقعہ نہ ہو سکی اور ان کی پنشن بحال نہ ہوئی مگر اس سفر سے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ غالب کو کئی مقامات خود دیکھنے اور وہاں کے لوگوں سے ملنے کا موقع ملا۔ جس سے ان کی معلومات میں بڑا اضافہ ہوا اور اس معلومات سے غالب میں وہ فکر و شعور کی رفعتیں ابھریں جو اُسے سماج کے قریب لانے کا نہ صرف باعث بنیں بلکہ اسے ایک عظیم شخصیت بنانے میں بھی ممد و معاون ثابت ہوئیں۔

غالب نے سفر کلکتہ کے وقت کئی شہروں میں قیام کیا لیکن اُن میں لکھنؤ بنارس عظیم آباد اور کلکتہ قابل ذکر ہیں۔ جن کی سماجی زندگی نے غالب کے شعور پر کافی اثر ڈالا جس کا اظہار اُن کے شعر و ادب میں ملتا ہے اور وہاں کی سماجی زندگی کا نقشہ ہماری آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے اس وقت کے لکھنؤ کی درباری زندگی اس فارسی خط سے ظاہر ہو جاتی ہے جو غالب نے رائے چھجمل کو آغا میر وزیر اعظم لکھنؤ کے بارے میں لکھا ہے۔ لیکن وہاں کے ذی علم اور باحیثیت لوگوں نے جو عزت غالب کی اس وقت کی تھی اس کا اثر ان کے ذہن پر ہمیشہ رہا اور وہ لکھنؤ کو کبھی نہ بھلا سکے غدر دلّی کے بعد وہ لکھنو کو وہاں کی بحالی

امن وامان۔ شرفانوازی اور ادب نوازی کی بنا پر یاد کرتے رہے میر مہدی مجروح کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"بھائی لکھنؤ میں وہ امن وامان ہے کہ نہ ہندوستانی عملداری میں ایسا امن وامان ہوگا نہ اس فتنہ وفساد سے پہلے انگریزی عملداری میں یہ چین ہوگا امرائ اور شرفا کی حکام سے ملاقاتیں بقدر رتبہ تعظیم وتوقیر، پنشن کی تقسیم علی العموم۔ آبادی کا حکم عام، لوگوں کو کمال لطف اور نرمی سے آباد کرتے جاتے ہیں——"

شہر بنارس بھی غالب کو بے حد پسند آیا تھا۔ جس کا تذکرہ اپنے ایک خط میں اس طرح کیا ہے

"بنارس خوب شہر ہے اور میرے پسند ہے ایک مثنوی میں نے اس کی تعریف میں لکھی ہے اور "چراغ دیر" اس کا نام ہے"

"چراغ دیر" میں غالب نے بنارس اور صبح بنارس کا بڑا حسین نقشہ کھینچا ہے لیکن یہاں چند اشعار پیش کرنا ہی برمحل ہوگا۔ جن میں بنارس کی تعریف ہندوؤں کے مذہبی عقیدے اور صنم آشنا حسیناؤں کا تذکرہ ہے۔

تعالی اللہ بنارس چشم بد دور
بہشت خرم و فردوس معمور
بہ خوشش پر کاری طرز وجودش
ز دہلی مے رسد ہر دم درودش
بتانش را ہیولی شعلۂ طور
سراپا نور ایزد چشم بد دور
بتاں شنخ مشرباں چوں لب کشایند
بہ کیش خویش کاشی را ستایند
کہ ہر کس کاندراں گلشن بمیرد
دگر پیوند جسمانی نگیرد
چمن سرمایۂ امید گردد!
بہ مردن زندۂ جاوید گردد!

بیا اے غافل از کیفیتِ ناز
نگہ بر پریزادنش انداز!
نہادِ شان چو بوئے گل گراں نیست
ہمہ جانند جسمے درمیاں نیست
فلک را قشقہ اش گر بر جبیں نیست
پس از رنگینیٔ موج شفق چیست
سوادش پائے تختِ بت پرستان
سراپایش زیارت گاہِ مستاں!
عبادت خانۂ ناقوسیاں است
ہمانا کعبۂ ہندوستاں است
بہ سامانِ دو عالم گلستانِ رنگ
زتابِ رخ چراغانِ لبِ گنگ
تیامت قامتاں مژگاں درازاں
زمژگاں در صفِ دل نیزہ بازاں

غالب کو عظیم آباد کے ماحول اور آب دہانے بھی کافی حد تک متاثر کیا جس کا ذکر بھی اُن کے کلام میں ملتا ہے۔

گفتمش چوں بود عظیم آباد؟
گفت رنگین تراز فضائے چمن
گفتمش سلسبیل خوش باشد؟
گفت خوشتر نباشد از سوہن

☆

خوشتر بود آب سوہن از قند و نبات
بادی چہ سخن زنیل و جیحوں و فرات

ایں پارۂ عالمی کہ ہندش نام شد
گوئے ظلمات دسو ہنست آبحیات

٭

غالب کو کلکتہ بھی پسند آیا جو اس وقت انگریزوں کا صدر مقام تھا جہاں کئی صنعتیں اور ایجادات جو انگریزوں کی لائی ہوئی تھیں غالب کی نظر سے گزریں آموں کے ساتھ ساتھ انگلش شراب کی افراط اور مغربی بتان سیم تن نے بھی غالب کے شعور کو متاثر کیا اور وہ کلکتہ کی تعریف کرنے پر بھی مجبور ہو گئے۔ کلکتہ کی تعریف ان کے فارسی اور اردو کے اشعار میں ملتی ہے۔ چند اشعار بغرض ملاحظہ پیش ہیں ؎

حالِ کلکتہ باز جستم گفت
باید اقلیم ہشتمش گفتن ــــ!
گفتم ایں ماہِ پیکراں چہ کس اند
گفت خوبانِ کشورِ لندن!

کلکتہ کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں
اک تیر مرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے
وہ سبزہ زار ہائے مطرّا کہ ہے غضب
وہ نازنین بتانِ خود آرا کہ ہائے ہائے
صبر آزما وہ ان کی نگاہیں کہ حف نظر
طاقت ربا وہ ان کا اشارا کہ ہائے ہائے
وہ میوہ ہائے تازہ و شیریں کہ واہ وا
وہ بادہ ہائے ناب گوارا کہ ہائے ہائے

٭

غالب کے سفر رامپور بھی امداد اور معاشی آسانیاں فراہم کرنے ہی کے لئے ہوئے لیکن غالب کے خطوط اردو سے جہاں نوابین رامپور کے طور طریق

عادات و خصائل ۔ وضع قطع ۔ جود و کرم اور مہمان نوازی کا اندازہ ہوتا ہے وہاں رامپور شہر کی آبادی اور آب و ہوا کا علم بھی ہوتا ہے

رامپور کی کیفیت یوں بیان کی ہے ۔

" یہاں پتھر تو دوا کو بھی میسّر نہیں ——————— خشتی مکانات گنتی کے ہیں کچی دیواریں اور کھپریل ۔ سارے شہر کی آبادی اسی طرح پر ہے .... پانی کا شکر کس منہ سے ادا کروں ۔ ایک دریا ہے کوسی ——— سبحان اللہ ——! اتنا میٹھا کہ پینے والا یہ گمان کرے کہ یہ پھیکا شربت ہے ۔ ——————————— صاف ۔ سبک ۔ گوارا ——— سریع النفوذ ——— صبح کو خوب بھوک لگتی ہے لڑکے بھی تندرست آدمی بھی توانا "

میر مہدی مجروح کے ایک خط میں بھی رامپور اور کوسی کی تعریف اس طرح کی ہے ۔

" بیٹھو ——— یہ رامپور دارالسرور ہے ——— جو لطف یہاں ہے وہ اور کہاں ہے ۔ پانی سبحان اللہ ۔ شہر سے تین سو قدم کے فاصلے پر ایک دریا ہے کوسی اس کا نام ہے ، بے شبہ چشمہ آب حیات کی کوئی سوت اس میں ملی ہے خیر اگر یوں بھی ہے تو بھائی آب حیات عمر بڑھاتا ہے مگر اتنا شیریں کہاں ہو گا ۔ "

غالب میں جہاں کئی عادتیں جاگیردارانہ طرز زندگی کی پیدا وار تھیں وہاں کئی صفات قدرت نے بھی اس کو عطا کی تھیں جو اعلیٰ شخصیت اور بڑے پن کے لئے ضروری ہوتی ہیں ۔

ان میں سے ایک وہ ہمّت اور حوصلہ تھا ۔ جس نے اُسے ناختم ہونے والی مجبوریوں اور محتاجیوں کے باوجود زندگی سے بیزار نہیں ہونے دیا اور وہ ہاتھ پر ہاتھ دھر کر نہیں بیٹھا ۔ بلکہ ہر ناامیدی ایک نئی امید اور ایک نئی جدوجہد کا پیغام لائی ۔ اور اس طرح اسے غم نے بالآخر عقل و خرد کے رازہائے سربستہ سے آشنا کر دیا ۔ اور ایک وقت ایسا بھی آیا کہ غالب کو غموں پر مسکرانا

آگیا "درد کا حد سے گزرنا" ہی اس کا درماں ہوگیا اور رنج کی زیادتی ہی نے احساس رنج کو ختم کر دیا۔ جیسا کہ خود مرزا نے کہا ہے ؎

رنج کا خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے غم
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہوگئیں

مگر اس غم کی شدت پر قابو پانے اور زندگی کی ناہمواریت کو ایک حد تک ہموار بنانے میں غالب کی خوش مزاجی اور خوش مذاقی کا بھی کافی دخل ہے۔ جہاں وہ پیچیدہ سے پیچیدہ مسائل حیات اور ناخوشگوار واقعات کے شدید سے شدید اثر کو اپنی خوش مزاجی سے متوازن کر لیتے تھے۔ وہاں ان سے معمولی سے معمولی بد مذاقی کبھی برداشت نہیں ہوتی۔ وہ اس میں بھی ایک سلیقے اور رکھ رکھاؤ کے قائل تھے اور یہ بد مذاقی انہیں نہ صرف رہن سہن، لباس، گفتگو کتابت اور طباعت میں گوارا تھی۔ بلکہ گالیوں تک میں پسند نہ تھی۔

ایک مرتبہ ڈاک سے ایک لفافہ ملا اسے کھولا تو اس میں گالیاں لکھی تھیں۔ پڑھ کر مسکرا دیئے اور کہا۔

"اس الّو کو گالی دینی بھی نہیں آتی ــــ بڈھے یا ادھیڑ آدمی کو بیٹی کی گالی دیتے ہیں تاکہ اس کو غیرت آئے۔ جوان کو جورو کی گالی دیتے ہیں کیونکہ اسکو جورو سے زیادہ تعلق ہوتا ہے، بچے کو ماں کی گالی دیتے ہیں۔ کہ وہ ماں کے برابر کسی سے مانوس نہیں ہوتا۔ یہ قرم ساق جو بہتر برس کے بڈھے کو ماں کی گالی دیتا ہے اس سے زیادہ بیوقوف کون ہوگا ــــ"

غالب کی اس خوش مزاجی اور خوش مذاقی نے اُس کی تحریر میں ایک سلیقہ اور رکھ رکھاؤ پیدا کر دیا تھا جس سے انداز بیاں میں ایک لطافت اور بانکپن پیدا ہوگیا۔

غالب کی طبیعت اور مزاج میں انسان دوستی اور حقیقت پسندی کی وہ اعلیٰ

صفات بھی موجود تھیں جو انہیں اپنے معاشرہ اور فرد سے قریب تر لانے کا بڑی حد تک سبب بنیں وہ جس میں بھی جوہر قابل پاتے قدر کرتے تھے یہی وجہ تھی کہ اُن کی دوستی مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ہندو اور انگریزوں سے بھی تھی وہ اپنی طبیعت کے متعلق خود کہتے ہیں۔

"میں تو بنی آدم کو مسلمان ہو یا ہندو یا نصرانی عزیز رکھتا ہوں اور اپنا بھائی گنتا ہوں ــــ"

ان کے ہندو دوستوں اور شاگردوں سے بھی ایسے ہی شگفتہ اور خوشگوار تعلقات تھے۔ جس طرح مسلمانوں سے بلکہ غالبؔ ان کی دوستی پر اور وہ غالبؔ کی رواداری پر بھروسہ کرتے تھے۔ منشی ہرگوپال تفتہ کو مثل فرزند ہی جانتے اور سمجھتے تھے۔

ایک خط میں منشی نبی بخش کو لکھتے ہیں۔

"واللہ تفتہ کو میں اپنے فرزندوں کی جگہ سمجھتا ہوں اور مجھ کو ناز ہے کہ خدا نے مجھ کو ایسا قابل فرزند عطا کیا"

خطوط غالبؔ شائع کرنے کا خیال بھی سب سے پہلے منشی شیو نرائن آرام اور تفتہ کو ہی پیدا ہوا اور انہوں نے غالبؔ سے اشاعت کی اجازت مانگی ۔ یہ اور بات ہے۔ کہ وہ اس وقت ان کی تحریک پر رضامند ہوئے۔ غالبؔ نے جو مقدمہ ازالہ حیثیت عرفی، Defamation کا برخلاف امین الدین دائر کیا تھا اس میں بھی فہرست گواہان پیش کردہ غالبؔ میں پیارے لال آشوب اور منشی حکم چند کو شامل کیا گیا تھا۔ جبکہ غالبؔ کے گواہوں کی کل تعداد پانچ تھی برخلاف اس کے امین الدین کی فہرست گواہاں میں ایک بھی ہندو گواہ نہ تھا۔

غالبؔ کے انگریزوں سے بھی اچھے تعلقات تھے اور وہ اُن کی لائی ہوئی ایجادات اور انکشافات کے بے حد مداح تھے۔ بعض لوگ غالبؔ کی اس ستائش کو انگریز پرستی کا الزام بھی دیتے ہیں۔ مگر یہ درست نہیں ہے

غالبؔ ایک حساس اور باشعور آدمی تھے اُن پر نہ تو صرف جذبات کا اثر ہوتا تھا اور نہ رسم ورواج کا بلکہ وہ ہر چیز کے حقیقی اور افادی پہلو کو سامنے رکھ کر کوئی رائے قائم کرتے تھے ——————————

وہ دیکھ رہے تھے کہ انگریزی اقتدار کے جلَو میں ایک صنعتی اور مشینی تہذیب سماج میں داخل ہو رہی ہے جو نہ صرف انسان کی فہم وادراک میں اضافہ کرے گی بلکہ انسانی زندگی کو خوشتر بنانے کا وسیلہ بھی ٹھیرے گی۔ اس لئے وہ اس برق وبخارات کی تہذیب کو خوش آمدید کہتے نظر آتے ہیں جبکہ دوسرے اہل دہلی ابھی تک شک وشبہ کے بھنور میں پھنسے تھے اور ترقی کا یہی نظریہ اس وقت بھی محل نظر تھا جب غالبؔ نے آئین اکبری کی تقریظ لکھی یہ ان کی انسان دوستی اور حقیقت پسندی ہی تھی کہ جہاں مسلمانوں کے درد، دُکھ اور جان ومال کا زیاں غالبؔ سے نہیں دیکھا جاتا تھا وہاں غدر میں انگریزوں پر جو ظلم اور زیادتیاں ہوئیں وہ بھی ان سے نہ دیکھی گئیں۔

ایک جگہ لکھتے ہیں

"انگریز کی قوم میں سے جو اُن روسیاہ کالوں کے ہاتھوں قتل ہوئے اُن میں سے کوئی میرا اُمید گاہ تھا —— اور کوئی میرا شفیق، کوئی میرا دوست اور کوئی میرا یار اور کوئی میرا شاگرد"

غالبؔ، ذوقؔ اور مومنؔ کی بھی نہ صرف دل سے قدر کرتے تھے۔ بلکہ اُن کا وجود دِلّی کے لئے ضروری سمجھتے تھے۔ اور ان کے انتقال پر افسوس کیا ہے میاں نبی بخش کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"یہاں کا حال تازہ یہ ہے کہ میاں ذوقؔ مر گئے۔ حضور والا نے ذوقِ شعر وسخن ترک کر دیا ہے۔ ——————————

سچ تو یہ ہے کہ یہ شخص اپنی وضع کا ایک اور عصر میں غنیمت تھا"

مومنؔ کے انتقال پر لکھتے ہیں۔

"یہ شخص بھی اپنی وضع کا اچھا کہنے والا تھا۔ طبیعت اس کی معنی

آفرین بھی ــــــ"

غالبؔ کے رشتہ دار اور اعزاء ان کی آزادروی اور رندمشربی کی وجہ سے کچھ لئے دیئے رہتے تھے۔ مگر یہ ضرور ان کا خیال رکھتے تھے۔ لیکن غالبؔ کے دوست احباب اُن پر جان چھڑکتے تھے غالبؔ بھی دوستوں کے بہترین دوست تھے۔ اور دوستی نبھانا جانتے تھے۔

اُن کی دوستی میں مہر و مروّت بھی ہوتی تھی اور خلوص بھی۔ دوستوں سے جب بھی ملاقات ہوتی بے حد خوش ہوتے اور اُن کے خطوط کے منتظر رہتے تھے خود بھی بڑی پابندی کے ساتھ دوست احباب کو خطوط لکھتے۔ اور ان کے اشعار پر اصلاح دیتے تھے۔

انہوں نے یہ اخلاقی پابندی خود پر اُس وقت تک لازم رکھی جب تک ضعف اور بیماری نے ہاتھوں میں رعشہ اور آنکھوں کی بینائی کم نہ کردی بلکہ اس کے بعد بھی لیٹے لیٹے خطوط لکھا کرتے تھے۔ اور جب یہ بھی نہ ہوسکا تو کسی دوست کے آجانے پر اس سے خطوط کا جواب لکھا دیا کرتے تھے

ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"اب خط نہیں لکھ سکتا ــــ آگے لیٹے لیٹے لکھتا تھا۔ اب ضعف اور بصارت کے سبب وہ بھی نہیں ہوسکتا ــــ"

غالبؔ کے ذرائع آمدنی حالانکہ محدود تھے پھر بھی بقول حالیؔ وہ غریبوں، معذوروں اور حاجت مندوں کی حتی الوسع امداد کرتے تھے۔ ایک مرتبہ غدر کے بعد اپنے ایک دوست کو جو غدر سے قبل باحیثیت، خوش وضع اور خوش پوش تھے۔ چھینٹ کا فرغل پہنا دیکھ کر بے حد رنجیدہ ہوئے اور پھر ان کی خودداری کے احترام کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنا قیمتی فرغل اُن کو دے دیا۔

غالبؔ دِلّی تقریباً ۱۸۱۶ء میں جب اٹھارہ انیس برس کی عمر تھی شادی کے بعد پہنچے۔ اور تادم آخر وہاں رہے لیکن انہیں دلّی سے جس قدر انسیت تھی اس قدر آگرہ سے نہ تھی اور اگر وہ سہولتیں اور آسانیاں میسّر آجاتیں کہ جن

سے غالب حسب منشاء اپنی زندگی گزار سکتے تو شاید وہ دلی سے باہر قدم نکالنا بھی گوارا نہ کرتے۔

اس میں شک نہیں کہ دِلّی جہانِ انقلابات کا مرکز رہی ہے اور کئی بار بگڑی اور سنوری ہے وہاں ہمیشہ تہذیبی، ادبی، سماجی اور سیاسی سرگرمیوں کی بھی آماجگاہ رہی ہے اس کی دلکشی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ یہاں ہر اہلِ فن کو اس کے ذہنی شعور کے مطابق تسکین ذوق کا سامان بھی مہیّا ہوتا رہا ہے اور وہ معاشرہ بھی جو اس کی طبعیت اور مزاج کے عین مطابق ہو یہی وجہ تھی کہ میرؔ کو بھی دلی بڑی پسند تھی اور اس کے گلی کوچے بھی انہیں "اوراق مصوّر" سے کم نہ معلوم ہوتے تھے۔

غالبؔ جب دِلی آئے تو اس وقت دِلّی پر انگریزوں کا قبضہ ہو چکا تھا اور ان کی حکومت کو روز بروز استحکام حاصل ہوتا جا رہا تھا۔ اس استحکام سے وہ افراتفری، قتل و غارت گری اور بربادی و تباہی جو تقریباً ساٹھ ستّر برس سے دلی کا مقدّر بن چکی تھی نہ صرف ختم ہو گئی تھی بلکہ دلّی کی زندگی اور ماحول میں بھی ایک سکون اور ایک استقلال پیدا ہو گیا تھا۔ اور وہ دلی جہاں سے میرؔ اور سوداؔ الصدیاس و ناامیدی کچھ برس پہلے، رات دن کے ہنگاموں اور آئے دن کی ہلاکت و خونریزی، ظلم اور زیادتی سے دل برداشتہ ہو کر لکھنو چلے گئے تھے۔ ایک بار پھر ذوقؔ۔ مومنؔ۔ ظفرؔ اور شیفتہ کے شعرو نغمہ سے رنگارنگ ادبی محفل بن گئی تھی۔

مولانا اسمٰعیل شہید۔ مولانا فضل الحق خیرآبادی۔ مفتی صدرالدین آزردہ مولانا سید احمد بریلوی اور امام بخش صہبائی نے بھی اپنی قابلیت اور ذہانت سے یہاں ایک علمی فضا قائم کر لی تھی اور اس مغربی تہذیب کے بھی کچھ واضح اور کچھ دھندلے نقوش صنعتی اور مشینی انکشافات کی شکل میں یہاں کی سماجی زندگی میں ابھرتے نظر آ رہے تھے۔ جو انگریزوں کی لائی ہوئی تھی۔ اس طرح دِلی پھر ادبی، علمی، اور صنعتی زندگی کا ایک مرکز بن گئی تھی ان حالات میں غالبؔ جیسے

حساس ۔ جدت پسند اور باشعور شخص کا دِلّی میں دل لگ جانا اور یہاں کی علمی، ادبی اور سماجی زندگی سے متاثر ہونا اور خود حصّہ لینا لازمی اور یقینی تھا لیکن اب بھی کچھ اہلِ ہند اور خاص کر مسلمان، فرنگی نظام حکومت کے طور طریق اور نظریات سے مطمئن نہیں تھے۔ اور ان کے ذہنوں میں تذبذب نفرت اور شک و شبہ کی چنگاریاں سُلگ رہی تھیں اور یہ وہی ذہنوں میں دبی ہوئی چنگاریاں تھیں جنہوں نے دلّی اور اس کے گرد و نواح کے کئی شہروں کو ۱۸۵۷ء میں آگ اور خون کی لپیٹ میں لے لیا اور ایک بار پھر دلّی کی تہذیبی، ادبی اور سماجی زندگی تباہ ہو گئی ۔ کئی کردہ اور ناکردہ لوگ قتل ہوئے ۔ کئی پھانسی پر چڑھا دیئے گئے۔ کئی ایسے روپوش ہوئے کہ ان کا پتہ نہ چلا

۔۔۔ کئی جلاوطن کر دیئے گئے ۔ بہادر شاہ ظفر کو بھی انگریزوں نے قید کر لیا اور سزا دے کر رنگون بھیج دیا ان جانکاہ اور لرزہ خیز واقعات کا اثر غالب کے دل و دماغ پر گہرا تھا جس کا اظہار انہوں نے بڑی دردمندی اور دل سوزی کے ساتھ زبان و قلم سے اپنے شعر و ادب میں جا بجا کیا ہے ۔ یہ ضرور ہے شاعری میں کم اور نثر میں زیادہ ـــ

غزل کے ایک شعر میں کہتے ہیں ـــ

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تو نے وہ گنج ہائے گرانمایہ کیا کیے

اسی احساس کا اظہار ایک جگہ اور اسطرح کیا ہے ؎

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

اور نثر میں "دستنبو" اور وہ خطوط ہیں جو غالب نے اپنے دوست احباب کو غدر کے بعد لکھے ہیں ۔

غالب کے تذکرہ موسومہ "دستنبو" کو اُن کی پرائیوٹ ڈائری ہی کہا جا سکتا ہے ۔ کیونکہ نہ تو اس کی تاریخی حیثیت مسلّم ہے اور نہ وہ غدر کی محض

داستان ہے۔ کیونکہ اس میں وہی کچھ بطورِ شغل تحریر کیا گیا ہے جو غالبؔ پر دورانِ غدر بیتا یا وہ جو سُنا اور وہ جو بعد غدر خود دیکھا، بلا یہ تحقیق و تفتیش کئے ہوئے کہ معاملات کی نوعیت کیا ہے اور واقعات کی صورت حال کیوں ایسی رہی بلکہ بعض واقعات تو تابع مصلحت سرے سے سپردِ قلم ہی نہیں کئے گئے۔ خود غالبؔ ایک خط میں صاحب عالم مارہروی کو لکھتے ہیں۔

"۱۱ر مئی ۱۸۵۷ء کو یہاں فساد شروع ہوا۔ میں نے اسی دن سے گھر کا دروازہ بند اور آنا جانا موقوف کر دیا۔ بے شغل زندگی بسر نہیں ہوتی اپنی سرگزشت لکھنی شروع کی ـــــ جو سنا گیا وہ بھی ضمیمہ سرگذشت کرتا گیا"

تفتہ کو ایک خط میں لکھتے ہیں

"اس فتنہ و آشوب میں کسی مصلحت میں میں نے دخل نہیں دیا۔"

اس کے علاوہ اس تذکرہ میں ۱۱ر مئی ۱۸۵۷ء سے آخر جولائی ۱۸۵۸ء تک کا حال لکھا گیا ہے۔

خود مرزا یوسف کو لکھتے ہیں۔

"ہاں تم کو اطلاع دیتا ہوں کہ مئی کی گیارہویں ۱۸۵۷ء سے جولائی کی اکتیویں ۱۸۵۸ء تک پندرہ مہینے کا اپنا حال میں نے نثر میں لکھا ہے اور وہ نثرِ فارسی زبان قدیم میں ہے ـــــ"

مگر غالبؔ کے خطوط کی اہمیت اس وجہ سے زیادہ ہے کہ وہ بلا اس خوف کے کہ وہ منظر عام پر آسکیں گے۔ اپنے بے تکلف دوست احباب کو لکھے گئے ہیں جو غدر کے حالات اور غالبؔ کے دل گداختہ کی صحیح ترجمانی کرتے ہیں۔ ـــــــــ ـــــ

نہ صرف یہ بلکہ وہ سماجی زندگی جو غدر کے وقت، اس سے قبل اور اس کے بعد دلی میں موجود تھی۔ اس کی بھی صحیح تصویر ان خطوط سے آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے مگر یہاں ہم بخوف طوالت صرف جستہ جستہ حوالوں سے غالبؔ کے سماجی شعور اور اس معاشرتی زندگی کا اندازہ لگانے کی کوشش کریں گے۔ جو ان کے گرد و پیش موجود تھی۔

ایک خط جو ۶؍ اکتوبر ۱۸۵۳ء کو منشی نبی بخش کے نام لکھا گیا ہے اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت دلّی میں اجناس کے بھاؤ کیا تھے۔

"یہاں چنا، گیہوں، بیسن۔ بائیس سیر اور گھی دو سیر سوا دو سیر ہے"

ایک خط جو ستمبر ۱۸۶۰ء کو چوہدری عبدالغفور کو لکھا گیا ہے اس میں بھی اجناس کا بھاؤ یہ تحریر کیا گیا ہے "

"غلہ گراں ہے موت ارزاں ہے میوہ کے مول اناج بکتا ہے ماش کی دال ۸؍ سیر۔ باجرہ ۱۲؍ سیر۔ گھی ۱۰؍ سیر۔ ترکاری مہنگی۔"

مذکورہ بالا حوالوں سے پتہ چلتا ہے کہ سات سال کے عرصہ میں اور خاص طور پر غدر کے بعد کس قدر فرق اجناس کے بھاؤ میں ہو گیا تھا۔ جس کو "میوہ کا مول" بتایا گیا ہے۔ اور آج ایک صدی بعد کے عام بھاؤ کا اندازہ بھی اس وقت کی قیمت اجناس سے لگایا جا سکتا ہے جبکہ ہم سائنسی اور مشینی اعتبار سے اس دور سے کہیں زیادہ ترقی یافتہ ہو چکے ہیں۔

غدر کے بعد دلّی کی معاشرتی زندگی اور احوال و کیفیات میں جو تبدیلیاں رونما ہوئیں اس کا اندازہ ذیل کے اقتباسات سے لگایا جا سکتا ہے۔

"کیا پوچھو دلّی کی ہستی منحصر کئی ہنگاموں پر ہے قلعہ[۱] چاندنی چوک[۲] ہر روز مجمع بازار مسجد جامع کا[۳] ہر ہفتہ سیر جمنا کے پُل کی[۴] ہر سال میلہ پھول والوں کا[۵]۔ یہ پانچوں باتیں اب نہیں پھر کہو دلّی کہاں۔ ہاں کوئی شہر قلمرو ہند میں اس نام کا تھا۔"

"دوستو اب تمہاری دلّی کی باتیں ہیں چوک میں بیگم کے باغ کے دروازے کے سامنے حوض کے پاس جو کنواں تھا اس میں سنگ و خشت و خاک ڈال کر بند کر دیا۔ بلیماروں کے دروازہ کے پاس کئی کئی دوکانیں ڈھا کر راستہ چوڑا کر لیا گیا۔"

"صاحب کیسی صاحبزادوں کی سی باتیں کرتے ہو۔ دلّی کو ویسا ہی آباد جانتے ہو جیسے آگے تھی۔ قاسم جان کی گلی میر خیراتی کے پھاٹک سے فتح اللہ بیگ خان

کے پھاٹک تک بے چراغ ہے"

"شہر میں ہے کون جو آوے گھر کے گھر بے چراغ پڑے ہیں ۔ ملزم سزا پاتے جاتے ہیں ۔

— جرنیلی بندوبست (مارشل لا) یازدہم مئی سے آج تک یعنی شنبہ پنجم دسمبر ۱۸۵۷ء تک بدستور ہے .... یہاں باہر سے اندر کوئی بغیر ٹکٹ کے آنے جانے نہیں پاتا ۔"

"اب آہنی سڑک کے واسطے کلکتہ دروازہ سے کابلی دروازہ تک میدان ہو گیا پنجابی کٹرہ — دھوبی واس کا واڑہ رام جی گنج ۔ سعادت خاں کا کٹرہ ۔ جرنیل بی بی کی حویلی نہیں ۔ رام جی داس گودام والے کے مکانات ۔ صاحب رام کا باغ، حویلی ان میں سے کسی کا پتہ نہیں ملتا

— قصہ مختصر شہر صحرا ہو گیا تھا ۔ اب جو کنوئیں جاتے رہے اور پانی گوہر نایاب ہو گیا تو یہ صحرا صحرائے کربلا ہو جائے گا ۔ اللہ اللہ دلی نہ رہی اور دلی والے یہاں کی زبان کو اچھا کہے جاتے ہیں ۔ واہ رے حسن اعتقاد — ارے بندہ خدا اردو بازار نہ رہا اردو کہاں — دلی اب شہر نہیں — کیمپ چھاؤنی ہے ۔ نہ قلعہ نہ شہر نہ بازار نہ نہر —"

"شہر کا حال میں کیا جانوں کیا ہے — پون ٹوٹی کوئی چیز ہے ۔ وہ جاری ہو گئی ہے سوائے اناج اور اپلے کے کوئی چیز ایسی نہیں جس پر محصول نہ لگا ہو —" ۸ نومبر ۱۸۵۹ء

" واللہ ڈھونڈنے کو مسلمان اس شہر میں نہیں ملتا ۔ کیا امیر، کیا غریب، کیا اہل حرفہ اگر کچھ ہیں تو باہر کے ہیں — ہنود البتہ کچھ کچھ آباد ہو گئے ہیں"

" یہاں آدمی کہاں ہیں کہ اخبار کے خریدار ہوں ۔ مہاجن لوگ جو یہاں بستے ہیں وہ یہ ڈھونڈتے پھرتے ہیں کہ گیہوں کہاں سستے ہیں ۔ بہت سخی ہوگئے تو جنس پوری دیں گے کاغذ (اخبار) روپیہ مہینہ کا کیوں مول لیں گے"

غدر کے بعد پے در پے کئی مصیبتیں دلی کی سماجی زندگی پر اثر انداز ہوئیں

جس کا تذکرہ بھی غالب کے خطوط میں موجود ہے۔

"ایک غدر کالوں کا ـــــ ایک ہنگامہ گوروں کا ـــــ ایک فتنہ انہدام مکانات کا ـــــ ایک آفت وبا کی ـــــ ایک مصیبت کال کی ـــــ اب یہ برسات جمیع حالات کی جامع ہے .... قصہ مختصر کہ وہ اَن کال تھا کہ مینہ نہ برسا۔ اناج نہ پیدا ہوا۔ یہ پن کال ہے پانی ایسا برسا کہ بوئے ہوئے دانے بہ گئے۔ جنھوں نے ابھی نہیں بویا تھا وہ بونے سے رہ گئے" سن لیا

"پانچ لشکر کا حملہ پے درپے اس شہر پر ہوا۔ پہلا باغیوں کا لشکر اس میں اہل شہر کا اعتبار لٹا، دوسرا خاکیوں کا اسمیں جان و مال و ناموس و مکان و مکین و آسمان و زمین و آثار ہستی سراسر لٹ گئے۔ تیسرا لشکر کال کا اسمیں ہزار ہا آدمی بھوکے مرے چوتھا لشکر ہیضے کا اس میں بہت سے پیٹ بھرے مرے پانچواں لشکر تپ کا اسمیں تاب و طاقت نہ پائی ـــــ اب تک اس لشکر نے شہر سے کوچ نہیں کیا۔ میرے گھر میں دو آدمی تپ سے مبتلا ہیں۔"

غدر میں دلّی کے لوگوں کی جائیدادیں اور کاروبار تباہ اور اندوختہ اثاثہ لٹ گیا تھا غربت۔ مفلسی اور بدحالی بہت سے گھروں کا مقدر بن گئی تھی کسی معاشرے میں جب افلاس زیادہ ہو جاتا ہے تو اس کی اخلاقی اقدار کی گرفت بھی عام طور پر ڈھیلی پڑ جاتی ہے جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اس سماج میں جنسی لذت پرستی اور اخلاقی بے راہ روی پیدا ہو جاتی ہے دلّی کی بھی کچھ اسی قسم کی کیفیت ہو گئی تھی۔ جس کا تذکرہ بھی غالب نے کیا ہے

"وہ دلّی نہیں ہے جس میں اکیاون برس سے مقیم ہوں ـ ایک کمپ ہے مسلمان اہل حرفہ یا حکام کے شاگرد پیشہ، باقی سراسر ہنود ـــــ معزول بادشاہ کے ذکور جو بقیۃ السیف ہیں وہ پانچ پانچ روپیہ مہینہ پاتے ہیں ـــــ اناث میں سے جو پیرزن ہیں وہ کٹنیاں اور جوان ہیں وہ کسبیاں ؎ ـــــ ۱۲ فروری ۱۸۶۲ء

؎ غدر کے الزام میں انگریزوں نے کئی مغلیہ شاہزادوں کو قتل کر دیا یا پھانسی چڑھوا دیا باقی جو رہ گئے تھے۔ ان کے پانچ پانچ روپے وظیفے کر دیئے تھے۔

ظاہر ہے کہ اس قلیل رقم میں زندگی کا گزر بسر کس ڈھب پر ہو سکتا تھا۔ غالبؔ قلعہ معلیٰ کی اُن مفلوک الحال بیگمات اور شہزادیوں کی زندگی سے بھی متاثر تھے جس کا نقشہ انہوں نے تفتہ کی کتاب "سنبلستان" کی خراب طباعت کو بہانہ بنا کر کھینچا ہے۔

"اس بری کاپی کی مثال جب تم پر کھلتی کہ تم یہاں ہوتے اور بیگمات قلعہ کو چلتے پھرتے دیکھتے۔ صورت ماہ دو ہفتہ کی سی اور کپڑے میلے —— پائنچے لیر لیر جوتی ٹوٹی ——"

دلّی کے لوگوں کے اصل نام کے ساتھ ساتھ عرفیت رکھنے کے عام رواج سے انگریزوں کی ناواقفیت اور غدر کے بعد ان کے انصاف کا ایک دلچسپ واقعہ بھی تحریر کیا ہے۔

"حاکم نے پوچھا —— حافظ محمد بخش کون ——؟ عرض کیا کہ میں، پھر پوچھا کہ حافظ مموّں کون ——؟ عرض کیا کہ میں اصل نام میرا محمد بخش ہے" ممّوں" ممّوں" مشہور ہوں۔ فرمایا یہ کچھ بات نہیں حافظ محمد بخش بھی تم اور حافظ ممّوں بھی تم —— ہم مکان کس کو دیں —— مسل داخل دفتر ہوئی میاں ممّوں اپنے گھر چلے آئے۔"

آج غالبؔ کو یہ جہان رنگ و بو چھوڑے ہوئے ایک صدی بیت گئی اس عرصہ میں نہ صرف لوگ بدلے بلکہ ان کے مزاج بھی بدل گئے —— سوچنے اور سمجھنے کے طریقے اور انداز فکر و نظر بھی بدل گئے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ ہمارے عہد کی وہ سائنسی اور مشینی ترقی ہے جس کے مواصلاتی اور برقی رابطہ نے اس کرۂ ارضی کو ایک گھر کی طرح مختصر کر دیا ہے۔ اور اب کیفیت یہ ہے کہ دنیا کے کسی گوشے سے چیخ اٹھتی ہے تو بلا تاخیر ساری کائنات ارضی میں اس کا درد محسوس کیا جاتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس کرۂ ارضی پر بسنے والا انسان اب تو اسے اپنی رفعت اور ترقی کے لئے تنگ اور ناکافی سمجھتا ہے اس کی اب جولانگاہ اس دنیا سے نکل کر چاند اور تاروں پر کمندیں ڈالتا ہے اور وہ

خلا کی تسخیر کی جد و جہد میں ہمہ وقت مصروف عمل ہے۔ ——————

—— اس کی نظر خوب سے خوب تر کی جو یا ہے جس کے لئے تجربوں کی تو ضرورت ہے مگر مفروضوں کا کہیں گزر نہیں۔ ایسے سائنسی اور برقی ایجادات کے ترقی پذیر دور میں آج کے انسان کا " محو غم دوش " رہنا بظاہر مشکل ہی نظر آتا ہے

مگر ان تمام ترقیوں اور کامرانیوں کے باوجود انسان آج بھی ایسا معاشرہ تشکیل نہیں کر پایا۔ جس میں عدل و انصاف۔ مساوات اور خیر و فلاح کا دور دورہ ہو اور انسان امن و عافیت کے ساتھ زندگی گزار سکے وہ مایوسیاں اور بیزاریاں آج بھی سماج میں اسی طرح موجود ہیں جو کل تک غالب اور اس کے گرد و پیش کی سماجی اور معاشرتی زندگی پر اثر انداز تھیں بلکہ جو نتائج ہمارے تجربے اور مشاہدے سے اب تک برآمد ہوئے ہیں ان سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ معاشرے کے درد اور دکھ میں اضافہ ہوا ہے اور ان میں کمی کا کوئی امکان نہیں۔

غالبؔ بھی معاشرے کے ایک فرد تھے —— پھر ایک احساس اور درد مند دل رکھتے تھے ——————

—— انہوں نے اپنے دکھ کے ساتھ ساتھ اپنے سماج کا درد اور دکھ بھی شدت کے ساتھ محسوس کیا اور ان فطری جذبات اور حقیقی احساسات کا احترام بھی ہمیشہ ملحوظ خاطر رکھا —— جو ہر زمانہ اور ہر معاشرے میں انسان اور انسانیت کا لازمی حصہ رہے ہیں۔ اور ہمیشہ رہیں گے۔ ——————

—— سماج کے اسی درد، جذبہ اور احساس کے دلکش امتزاج اور حسین آویزش کو غالبؔ نے اپنے شعر و ادب میں کمال سلیقہ مندی اور بے باکی، اور شگفتگی کے ساتھ اپنے مخصوص لب و لہجہ اور دلچسپ انداز میں پیش کر دیا ہے۔

جس سے نہ صرف ان کے سماج کی واضح اور نمایاں تصویر قاری کے سامنے آجاتی ہے۔ بلکہ غالب کے سماجی شعور کا بھی صحیح اندازہ ہو جاتا ہے۔

اور یہی وہ کارنامہ ہے جس سے ایک فنکار عظیم سے عظیم تر ہو جاتا ہے ـــــ

غالبِ خستہ کے بغیر[۱]

بعض وقت بخت نارسا کا فیضان ہی عرفان و آگہی کے اس مقام تک پہنچا دیتا ہے، جہاں جذبہ و فکر اور زبان و بیان کے دیپک ایک وقار اور سلیقے کے ساتھ جگمگا اٹھتے ہیں اور اس روشنی کی گھمبیرتا سے وہ تخلیقی صلاحیتیں ابھرتی ہیں۔ جو ایک فنکار کو گنجینۂ صفات کا طلسم بنا دیتی ہیں اور وہ عظیم المرتبت بن جاتا ہے۔

جب ہم غالبؔ کی زندگی کا مطالعہ کرتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ ان کی زندگی غموں اور مایوسیوں کی آماجگاہ تھی۔ اور وہ ان غموں سے زندگی بھر مرتے رہے ——

کبھی مغلیہ تہذیبی و ثقافتی اقتدار کے درخشندہ دور کو خاموشیوں اور تاریکیوں میں گم ہوتا دیکھ کر، جو انہیں بے حد عزیز تھا کبھی فارسی شعر و ادب کی ناقدری سے جس میں اپنی فارسی شاعری کی ستائش نہ ہونے کا شکوہ بھی پوشیدہ تھا۔ کبھی وحدۃ الوجود کے اس تصوّر سے جس نے انسانی زندگی میں خودسپردگی، انفعالیت اور نفی ہستی کا جذبہ پیدا کر دیا تھا کبھی اپنی معاشی ناآسودگیوں سے۔ کبھی اپنے واقعہ اسیری سے۔ کبھی رشتہ داروں کی بے اعتنائی اور بے مروّتی سے کبھی معاصرانہ چشمک سے کبھی "اپنی نظم و نثر کی داد باندازہ بایست" نہ پانے سے —— کبھی اپنا سرکاری اعزاز اور خلعت منسوخ ہو جانے

---

[۱] یہ مضمون "ماہ نو" کراچی فروری ۱۹۶۹ء میں بعنوان "غالب کا مخصوص تصوّر غم" چھپا

سے، کبھی غدر میں لٹنے سے، کبھی غدر کے جانکاہ سانحہ میں "کوئی امید گاہ، کوئی شفیق، کوئی دوست اور کوئی شاگرد کے قتل" ہو جانے سے۔ کبھی دلی کی سماجی زندگی تباہ ہونے اور اس کے احوال وکیفیات میں تبدیلیاں رونما ہونے سے ـــ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ ان کیفیات اور موثرات سے غالبؔ کی زندگی میں درد وکرب کی، ایک شدید لہر تو اٹھی اور ایک ہلچل پیدا ہوئی لیکن میرؔ وغیرہ کی طرح بے چارگی اور بے بسی کی سی مریضانہ کیفیت کبھی پیدا نہ ہوئی۔ بلکہ اس احساس غم نے غالبؔ کے دل میں جینے کی تڑپ، مزاج میں تمکنت اور طبیعت میں بانکپن پیدا کر دیا۔

جینے کی آرزو نے انہیں وہ ہمت وحوصلہ بخشا کہ غموں پر مسکرانا اور زندگی سے پیار کرنا آگیا۔ تمکنت نے خود اعتمادی اور برتری کا احساس پیدا کیا اور طبیعت کے بانکپن کا نتیجہ جدت اور شوخی کی شکل میں نمودار ہوا جس نے غالب کے شعر ونغمہ میں جدت طرز، ندرت بیان اور آزادئ فکر کی روح بھر دی۔ مگر یہاں اس امر کا جائزہ لینا مقصود ہے کہ غالبؔ کی شاعری کی لَے اور اس کا زیر و بم کیا ہے؟ اس میں کوئی منفرد زاویۂ نگاہ اور جدید طرز احساس موجود ہے یا اپنے پیش رو شعرا کے افکار وخیالات کی محض عکاسی اور اگر نئے راستے نکالے اور تراشے ہیں تو ان سے کیا فن شعر میں کوئی اضافہ ہوا ہے؟ جو غالبِ خستہ کے بغیر ناممکن تھا۔

غالبؔ کے زمانے میں غزل ہی واردات حسن وعشق اور محسوسات قلبی کے اظہار کا مقبول ترین ذریعہ تھی۔ دیگر اصناف سخن میں بھی شعراء طبع آزمائی کرتے تھے خود غالبؔ نے بھی قصائد اور مثنویاں وغیرہ لکھیں۔ لیکن جو مقام اردو شاعری میں اس وقت تک غزل کو حاصل ہو گیا تھا۔ وہ دیگر اصناف شعر کو حاصل نہ ہو سکا تھا۔

غالبؔ کے پیشروؤں میں سوداؔ، میرؔ، دردؔ، ناسخؔ، آتشؔ، مصحفیؔ، شاہ نصیرؔ، جرأتؔ، انشاؔ، اور معاصروں میں ذوقؔ، مومنؔ، شیفتہؔ اور ظفرؔ وغیرہ نے

بھی صنفِ غزل میں اپنی شعوری اور فکری صلاحیتوں کا بھرپور اظہار کیا جس سے اردو شاعری میں غزل کا ایک گراں قدر سرمایۂ شعری جمع ہو گیا تھا لیکن اُردو غزل اس وقت تک فارسی غزل کا ایک نقش تھی۔

مغلیہ دورِ حکومت میں درباری اور سرکاری زبان فارسی تھی اور وہ ہند میں عزت و مرتبہ حاصل کرنے کا بھی ایک ذریعہ تھی چنانچہ اہل ہند بھی فارسی میں شعر کہنا پسند کرتے تھے۔ اس طرح فارسی شاعری اپنی تمام تر خصوصیات اور معتقدات کے ساتھ ہندوستان میں مقبول ہو گئی اردو شاعری جو اس عہد میں ابتدائی مراحل سے گزر رہی تھی۔ اس میں بھی جذبہ و فکر کے وہی سانچے انداز، طور، اور طریق اختیار کئے گئے جو فارسی شاعری کا طرۂ امتیاز سمجھے جاتے تھے۔

اردو شاعری کی جب ابتداء ہوئی اس وقت فارسی شاعری کا دورِ عروج تھا زبان میں پاکیزگی اور بیان میں پختگی پیدا ہو چکی تھی۔ نازک سے نازک جذبے اور باریک سے باریک خیال کا اظہار بحسن و خوبی کیا جا سکتا ہے مگر اس دور میں شعری مزاج تکلف، تصنع اور رنگ آمیزی کا عادی ہو چکا تھا۔

چنانچہ کسی خیال کا اظہار لفظی تضاد، محاوروں، استعاروں، تشبیہوں اور کنایوں میں کیا جانا اصل کمال شاعری سمجھا جاتا تھا۔ اس اشاریت اور ایمائیت سے شاعری میں ایک طلسماتی کیفیت پیدا ہو گئی تھی جس سے گزر کر قاری کا ذہن مطلب و معنی کی منزل تک پہنچتا تھا حقیقت پسندی اور سادگی جو شعر کی اصل صفات سمجھی جاتی ہیں بڑی حد تک مفقود تھیں۔

غالب کو فارسی زبان و ادب سے ایک فطری لگاؤ تھا اور اس کو وہ عطیۂ الٰہی سمجھتے تھے چنانچہ ایک خط میں غالب مرزا رحیم بیگ کو لکھتے ہیں۔

"زبان دانی فارسی میری ازلی دستگاہ اور یہ عطیہ خاص منجانب اللہ ہے۔ فارسی زبان کا ملکہ مجھ کو خدا نے دیا ہے۔ مشق کا کمال میں نے استاد سے حاصل کیا تھا۔

ایک جگہ اور مفتی سیّد عباس کے خط میں لکھتے ہیں۔

"مبداء فیاض کا مجھ پر احسانِ عظیم ہے ماخذ میرا صحیح اور طبع میری سلیم ہے فارسی کے ساتھ ایک مناسبتِ ازلی د سرمدی لایا ہوں مطابق اہل پارس منطق کا بھی مزہ ابدی لایا ہوں۔"

——— مناسبتِ خداداد، تربیت استاد، حسن و قبح ترکیب پہچاننے لگا فارسی کے غوامض جاننے لگا۔"

غالبؔ پر اس فارسی سے لگاؤ کا اثر یہ ہوا کہ انہوں نے بیشتر ایرانی اور ہندوستانی فارسی گو شعرا کے کلام کا مطالعہ بڑی سوجھ بوجھ، گہرائی اور گیرائی کے ساتھ کیا اور ان کے کلام سے اپنی فارسی شاعری کے لئے مشعلِ راہ کا کام لیا اور خود بھی فارسی شاعری کی وہی روش اختیار کر لی جو اس وقت دادِ سخن کے لئے ضروری سمجھی جاتی تھی۔

غالبؔ کی طبعیت موزوں تھی اور زبان فارسی سے فطری اور طبعی مناسبت جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ غالبؔ نے جدّتِ طبع اور ندرتِ بیان سے اپنی فارسی غزل میں جذبہ و فکر کے وہ گلہائے رنگ رنگ بکھیر دیئے جن کی نکہت اور دل آویزی کسی طرح فارسی کے اچھے شعراے کم نہ تھی۔

غالبؔ فارسی کے ساتھ اردو میں بھی شعر کہتے تھے۔ بلکہ ان کی شاعری کی ابتداء اردو شاعری سے ہوئی لیکن وہ اسے درخورِ اعتنا نہ سمجھتے تھے اور انہیں اپنی فارسی شاعری پر ہی ناز تھا۔

فارسی بیں تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ
بگزر از مجموعہ اردو کہ بیرنگ من است

اور ایک وقت جب حالات کے تحت ہندوستان میں فارسی کی قدر و منزلت کم ہونے لگی تو ان کی زبانِ قلم سے یہ شعر بھی نکل گیا۔

بود غالبؔ عندلیبے از گلستانِ عجم
من زِ غفلت طوطیٔ ہندوستاں نامیدمش

ایک خط میں بھی جو مولوی عبدالغفور خاں کو تحریر کیا ہے۔ لکھتے ہیں۔

"خاکسار نے ابتدائے سن تمیز میں اردو زبان میں سخن سرائی کی ہے پھر اوسط عمر میں بادشاہ دہلی کا نوکر ہو کر چند روز اسی روش پر خامہ فرسائی کی ہے۔ نظم و نثر فارسی کا عاشق اور مائل ہوں ہندوستان میں رہتا ہوں مگر تیغ اصفہانی کا گھائل ہوں۔ جہاں تک زور چل سکا فارسی زبان میں بہت کچھ بکا۔"

غالبؔ نے چونکہ فارسی شعر و ادب کا مطالعہ ژرف نگاہی اور باریک بینی سے کیا تھا۔ تکلف آمیزی اور صنعت گری سے طبعی لگاؤ تھا۔ جس سے ان کی اردو غزل پہلے پہل ایک چیستاں بن گئی۔ جس کا مزاج ایرانی زیادہ تھا اور ہندوستانی کم ——— مگر وقت اور تجربہ کے ساتھ ساتھ غالب کے ذہن و مزاج میں سادگی اور حقیقت پسندی کے جیسے جیسے دریچے کھلتے گئے ویسے ویسے ہی ان کی شاعری جامعیت اور اختصار کا گراں قدر نمونہ بنتی چلی گئی۔

غالبؔ کی زندگی اور فن پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں ان کی سب سے اہم اور نمایاں خصوصیات انانیت اور جدت پسندی دکھائی دیتی ہیں جن کی جلوہ گری اُن کے شعر و ادب میں جگہ جگہ نئے رنگ اور نئے روپ میں نظر آتی ہے۔ جو غالبؔ کو نہ صرف اپنے پیش رو اور ہم عصر شعرا میں سب سے ممتاز کرنے کا سبب بنتی ہیں بلکہ اسے ایک عظیم فنکار بنانے میں بھی ممد ثابت ہوتی ہیں۔

میری رائے میں یہ دونوں صفات غالبؔ کے احساسِ غم کا ہی نتیجہ ہیں ۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ غالبؔ نے پہلی بار اردو شاعری میں غم کو ایک علامت کے طور پر استعمال کیا ہے ۔ اور غم کے مخصوص معنی اور روایتی تصور کو وسیع تر معنی دیئے جس سے محرومی اور نارسائی کا احساس فزوں نہیں ہوتا بلکہ وہ زندگی میں ایک حرارت ، حرکت اور ہلچل پیدا کر دیتا ہے اور اس حرارت سے بددلی ، نارسائی اور پریشانی کی تاریکیوں میں بھی اُمید ونئی آرزوئں اور ارادوں کے چراغ روشن ہو جاتے ہیں جو حادثات زندگی اور کاروبارِ حیات سے عہدہ برآ ہونے کا ذریعہ بن جاتے ہیں ۔

غالبؔ غم آشنا تو ضرور ہیں لیکن غم پرست نہیں بلکہ وہ غم کی کرامت کے اس قدر سپاس گزار ہیں کہ اپنے علم و آگہی کو غم کا ہی اعجاز نظر سمجھتے ہیں اور اسی غم نے ان کی زندگی میں بہاروں جیسی شگفتگی اور شادابی بھر دی ہے ۔

یہی نہیں بلکہ ان کے شعر و ادب میں جہاں کہیں فکر و نظر نے نئی نئی راہیں تلاش کی ہیں اور نئی کروٹیں بدلی ہیں اس کا سبب بھی غم ہے ، غم کی ہی ان کے جہانِ شعر و سخن میں کارفرمائی نظر آتی ہے جس نے انہیں جنت کی سی حسین و سرمدی جلوہ گاہ عطا کی ہے ۔ اور دل کو سوز اور روح کو گداز بخشا ہے ۔ جس کا قائم و دائم رہنا غالبؔ ایک دل دیوانہ کے لئے بیحد ضروری سمجھتے ہیں ۔

غالبؔ کی مثنوی " مغنی نامہ " ان کے تصورِ غم کی پوری طرح نمائندگی کرتی ہے جس کے چند اشعار بغرض ملاحظہ پیش ہیں ۔

بدانش غم آموزگارِ من است
خزانِ عزیزاں ، بہارِ من است
غم کز ازل در سرشتِ من است
بود دوزخ ، اما بہشتِ من است

بدیں جادہ اندیشہ پیمودہ است
غم خضرِ راہ سخن بودہ است
من از خویشتن بادلِ دردمند
نوائے غزل برکشیدہ بلند
ز ریزداں غم آمد دل افروزِ من
چراغ شب داختر روزِ من
دلم ہمچو غالبؔ بہ غم شاد باد
بدیں گنج ویرانہ آباد باد!

ایک جگہ اور اسی غم کی احسانمندی اور ممنونیت کا اظہار اردو غزل میں بھی اس طرح کیا ہے ؎

مجھے انتعاشِ غم نے پئے عرضِ حال بخشی
ہوسِ غزل سرائی تپشِ فسانہ خوانی

⁂

یہی بار بار جی میں مرے آئے ہے کہ غالبؔ
کروں خوانِ گفتگو پر دل وجاں کی مہمانی

⁂

غالبؔ دل کے سوز اور زندگی میں حرکت دہلچل کے لئے غم کا ہونا ضروری سمجھتے ہیں۔ بلا تخصیص اس کے کہ وہ غم "غمِ عشق" ہو یا غمِ روزگار جس کی حقیقت "بیش از یک نفس" نہیں ہوتی۔

غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے
غمِ عشق اگر نہ ہوتا غمِ روزگار ہوتا

⁂

ممکن نہیں کہ بھول کے بھی آرمیدہ ہوں
میں دشتِ غم میں آہوئے صیاد دیدہ ہوں

؂

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس
برق سے کرتے ہیں روشن شمعِ ماتم خانہ ہم

؂

غالب غم کو حیاتِ انسانی کی تربیت کا ایک ذریعہ سمجھتے ہیں اور اس میں شک بھی نہیں کہ ایک فنکار "دل گداختہ" اور حسن عملا ہی فن کے کمال تک پہنچ سکتا ہے۔ اسی لئے غالب کو درد و غم اس قدر عزیز ہے کہ وہ اس میں کوئی کمی برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں کیونکہ غم کی کمی ان کے دل میں ایک بے چینی پیدا کر دیتی ہے۔ ان کا جی تو "راہ کو پرخار" دیکھ کر خوش ہوتا ہے بلکہ وہ تو زمانہ اور محبوب کے جور و ستم میں بھی کمی کے رجحان کو پسند نہیں کرتے۔

پھر اک دل کو بے قراری ہے
سینہ جویائے زخمِ کاری ہے

؂

کرتا ہوں جمع پھر جگر لخت لخت کو
عرصہ ہوا ہے دعوتِ مژگاں کئے ہوئے

؂

ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں
جی خوش ہوا ہے راہ کو پرخار دیکھ کر

؂

زمانہ سخت کم آزار ہے بجانِ اسد
وگرنہ ہم تو توقع زیادہ رکھتے ہیں

؂

واحسرتا کہ یار نے کھینچا ستم سے ہاتھ
ہم کو حریصِ لذّتِ آزار دیکھکر

٭

آغشتہ ایم بر سرِ خار بخونِ دل —!
قانون باغبانیٔ صحرا نوشتہ ایم

٭

غالبؔ کو اپنے منہ کے واسطے ہی سے دوسروں کے درد و غم کا احساس ہوتا ہے۔ اور وہ اس لہو کے قائل نہیں جس کا مقصد صرف زندگی کو قائم رکھنے کے لئے رگوں میں گردش کرنا ہو ان کے نزدیک لہو وہ ہے جو دوسروں کے غم میں بطور ہمدردی آنکھوں سے بشکل اشک ٹپکتا جاتا ہو۔ اور ٹپک بھی سکتا ہو۔

رگوں میں دوڑتے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے

غالبؔ کا غم "عشقیہ واردات" کا نہیں۔ "روزگار" کا ہے اُن کا غم بقول رشید احمد صدیقی "کھائیں گے کیا کا غم ہے" جس کی نکر سے ان کی شاعری کی لے میں حزن و ملال کی ایک لہر تو اٹھتی نظر آتی ہے مگر وہ شکستگی پیدا نہیں ہوتی جو قوائے فکر و عمل کو مضمحل کر دے۔ بلکہ غموں پر مسکرانے کا ایک عزم اور ایک حوصلہ ملتا ہے۔

اس میں شک بھی نہیں کہ کم ہمت انسان میں خود سپردگی مایوسی اور کم ہمتی کا وہ احساس پیدا ہو جاتا ہے جو اسے وقت کے دھاروں اور زمانے کے تیوروں کو سمجھنے اور دیکھنے کی صلاحیت سے یکسر محروم کر دیتا ہے وہ کسی خواہش کی ناکامی اور کسی آرزو کی پامالی سے دل گرفتہ اور نڈھال ہو جاتا ہے جس سے مشکلات اور نامساعد حالات پر قابو پاکر آگے بڑھنے کا جذبہ نہیں ابھرتا اور اس میں برتری، عزتِ نفس، ہمت اور حوصلے کی کارفرمائی نظر نہیں

آتی ۔ بلکہ میں تو سمجھتا ہوں کہ بعض اوقات کم ہمتی اور پست حوصلہ ہی انسان کی تکالیف میں اضافہ کا سبب بن جاتا ہے مگر غالب کا یہ عزم و حوصلہ ہی تھا جس سے ان کی زندگی میں عمل پیہم کا جذبہ ابھرا اور ان کی طبیعت اور مزاج کو عقل و شعور کی رفاقت میسّر آ گئی

خود کہتے ہیں۔

اپنا نہیں وہ شیوا کہ آرام سے بیٹھیں
اس در پہ نہیں بار تو کعبہ ہی کو ہو آئے

غالب کا غم نہ میر کا غم ہے نہ فانی کا ——— میر عمر بھر "غمِ جاناں اور غمِ روزگار" کا شکار رہے ۔ ان کے غم میں مغلیہ تہذیب و تمدّن کے نقوش دھندلے پڑ جانے کا شدید احساس بھی موجود ہے اور یہ خدشہ بھی کہ کہیں یہ نقوش مِٹ نہ جائیں ۔

یہی وجوہات ہیں کہ میر کی شاعری میں کلیوں کا تبسّم اور پھولوں کی جوانی نہیں ملتی ۔ گل اور گلستاں ضرور ہیں مگر خزاں رسیدہ ۔ وہ اپنے غم اور معاشرے کے غم کا مرقع بن کر رہ گئے ہیں ان کا غم آشیاں کے جل جانے پر کبھی رونے اور کبھی خاک نشیمن کو سجدے کرنے کی اضطراری کیفیت کی نمائندگی کرتا ہے اور اسی کو زندگی اور ہنگامہ زندگی سمجھتا ہے لیکن تعمیرِ نو کی نشاندہی نہیں کرتا ۔

غالب کا غم اس لئے عظیم ہے کہ وہ آشیاں کے جل جانے کا غم بھی کرتا ہے ۔ اور اس کے خاکستر پر نئے آشیاں کے تعمیر کا عزم بھی رکھتا ہے ۔ بلکہ اس حوصلہ کی وساطت سے مستقبل میں جدید آشیاں بن جانے کی بھی پیشگوئی کرتا ہے ۔

برخلاف اس کے میر کی شاعری سے سپردگی قناعت ، رقّت اور درد کا پیغام ملتا ہے جو انسان کو شکست روی اور سہل انگاری کی راہ پر ڈال دیتا ہے ۔

میرؔ کے یہاں غالبؔ جیسا وہ عزم و حوصلہ نہیں ملتا جو غم پر فتح یاب ہو کر ذہنِ انسانی میں جستجو، تلاش اور تجربے کے دریچے کھول دے اور گم گشتہ راہ کی راہنمائی کرے۔

نگہ گرم سے اک آگ ٹپکتی ہے اسدؔ
ہے چراغاں خس و خاشاک گلستاں مجھ سے

اس میں شک نہیں کہ میرؔ کی اپنی اور اردگرد کی زندگی بے حد پُر درد اور غمگین تھی جس سے ان کی شاعری درد و غم اور سوز و گداز کی تصویر بن کر رہ گئی۔ میرؔ نے نادر شاہ کے حملہ کے بعد دلّی کی تباہی، احمد شاہ کی قتل و غارت گری، مرہٹوں، جاٹوں اور روہیلوں کا ظلم اور زیادتیاں بچشم خود دیکھی تھیں اور ان حالات و واقعات کا اثر ان کے دل و دماغ اور شاعری پر گہرا تھا۔ جس کے متعلق وہ خود کہتے ہیں۔

ہم کو شاعر نہ کہو میرؔ کہ صاحب ہم نے
درد و غم کتنے کیے جمع تو دیوان کیا

مگر ہم دیکھتے ہیں کہ اُن کے دور میں مغلیہ سلطنت زوال پذیر ہوتی رہی حکمراں بدلتے رہے لیکن تہذیب نہیں بدلی۔

غالبؔ کا دور وہ تھا جب تہذیب بدل رہی تھی اور غالبؔ دو تہذیبوں کے سنگم پر کھڑے تھے۔ ایک تہذیب جس سے غالبؔ کے حسب نسب طبیعت و مزاج کا براہ راست تعلق تھا اپنی تمام تر جلوہ سامانیوں کے بعد ہندوستان سے رخصت ہو رہی تھی دوسری تہذیب جو برق و بخارات، ایجادات و انکشافات کی تہذیب تھی۔ نئے حاکموں کے جلو میں دبے پاؤں یہاں کے معاشرے میں داخل ہو رہی تھی۔ جس کے نقش پا یہاں کی سطح زندگی پر ابھرنا شروع ہو گئے تھے۔

مغربی تہذیب کے اس چلن اور رنگ ڈھنگ کو دیکھ کر اہل ہند عموماً اور اہل دہلی خصوصاً گومگو تذبذب اور شک و شبہ کی کیفیات اور احساسات میں مبتلا تھے۔ قیاس ہے کہ غالبؔ پر بھی پہلی تہذیب کے ختم ہونے کا غم نسبتاً زیادہ

ہی ہوا ہوگا۔ لیکن غالبؔ محض جذبات کی رو میں بہہ جانے کے عادی نہیں تھے وہ حقیقت کو دیکھنے اور پیش آمدہ مسائل سے عہدہ برآ ہونے کی پوری صلاحیت رکھتے تھے اس لئے وہ پرانی تہذیب کا صرف ماتم نہیں کرتے یا اس کے غم کو شریک زندگی بنا کر خاموش نہیں بیٹھ جاتے بلکہ نئی تہذیب کو خوش آمدید کہتے بھی نظر آتے ہیں۔ جس کی پرچھائیاں اُن کے شعر و ادب میں ملتی ہیں۔

فانیؔ کے غم میں عمل سے گریز اور زندگی سے فرار کا پہلو بڑا نمایاں ہے اُس نے مر مر کے جینے کو ہی زندگی سمجھا ہے اس کے ہاں موت ہی اصل حیات ہے

ہر نفس عمر گزشتہ کی ہے میّت فانیؔ
زندگی نام ہے مر مر کے جیئے جانے کا

ؓ

موت جس کی حیات ہو فانیؔ
اس شہیدِ ستم کا ماتم کیا

ؓ

فانیؔ نے غم کے بحر میں غوطہ لگایا اور ڈوب کر رہ گیا غالبؔ کی طرح تہہ سے عزم و ہمت اور عمل حوصلہ کے درہائے گراں مایہ لے کر نہ ابھر سکا۔ برخلاف اس کے غالبؔ میں زندگی کی آرزو بھی موجود ہے اور حسرت گناہ بھی۔

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے
خوں ہو کے جگر آنکھ سے ٹپکا نہیں اے مرگ
رہنے دے مجھے یاں کہ ابھی کام بہت ہے
گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

ؓ

ہر کیف ان تینوں کے غم میں بڑا نمایاں فرق ہے فانیؔ نے غم میں صرف

اس کی حیات ملتی ہے وہ خالص شاعری (Pure Poetry) کا قائل ہے اسے کسی مقصد کے لئے استعمال کرنا پسند نہیں کرتا جس سے اس کے نزدیک شاعر شاعر کم اور ناصح زیادہ بن جاتا ہے۔

میرؔ اپنے غم کے ساتھ غم دوراں کو بھی شامل کر لیتے ہیں لیکن ان کے اضطراب میں ایک سکون ہے نئی زندگی کی جستجو نہیں۔ غالبؔ اپنے اور اپنے اردگرد کے غم کو محسوس کرتے ہیں لیکن اس سے دل شکستہ نہیں ہوتے۔ اُن کے غم میں سکون نہیں ہے بلکہ اضطراب اور حرارت ہے اور اس اضطراب میں ایک مقصدیت بھی چھپی ہے جو زندگی کو آگے بڑھنے کا سبق دیتی ہے اور غالبؔ کے غم کی یہی وہ روش ہے جو اسے میرؔ اور فانیؔ سے بلند کر دیتی ہے۔

مومنؔ اور ذوقؔ بھی غالبؔ کے دور کی پیداوار تھے مگر ان کی شاعری میں بھی غم کا وہ حقیقی احساس اور نیا انداز نہیں ملتا۔ جو غالبؔ کے شعر و نغمہ میں زندگی سے پیار کرنا سکھاتا ہے۔ مومنؔ عاشق مزاج ضرور تھے لیکن ان کا عشق طبعیت کی رنگینی کے ساتھ ساتھ صرف عالم شباب تک باقی رہا۔ جس سے دل میں وقتی طور پر درد پیدا ہوا اور اس درد کے اثر نے ہی ان کی شاعری میں سوز اور جذبات نگاری کا متوازن شعور پیدا کیا جو ایک غزل گو شاعر کے لئے ضروری بھی ہوتا ہے اور لازمی بھی۔ مگر ان کا واسطہ غم روزگار سے نہیں پڑا جس کا اثر حیاتِ انسانی پر دیر تک رہتا ہے اور جذبات کی سردی و گرمی کسی تغیر کا سبب نہیں بنتی۔ ذوقؔ ایک غریب گھرانے کے چشم و چراغ ضرور تھے مگر ان کی زندگی متاع و مرتبت کے ساتھ ساتھ آرام و سکون کی طرف گامزن رہی۔ اس لئے ان کے یہاں درد اور درماندگی کا احساس حقیقی اور دائمی نہیں ہے۔ بلکہ جہاں کہیں ہے روایتی ہے

ذوقؔ نے اپنی شاعری کا چراغ اپنی ذہانت اور پاکبازی سے روشن کیا ہے مگر وہ صنفِ غزل کے غالبؔ کی طرح عظیم اور مومنؔ کی طرح کامیاب شاعر نہ ہو سکے کیونکہ غزل وارداتِ حسن و عشق اور محسوسات قلبی کے اظہار کا ایک بڑا ہی لطیف ذریعہ ہے اور یہ محسوساتِ قلبی عشق و محبت اور درد و غم سے ہی پیدا ہوتے ہیں

عشق بھی درد وغم کا ہی دوسرا نام ہے غم نہ ذوق کی سرشت میں تھا اور نہ واسطہ پڑا تھا اس لئے وہ حقیقی سوز و گداز کی متوازن تپش جس سے غزل کی ساخت پرداخت ہوتی ہے ذوق کے یہاں مفقود ہے۔

غالب کے فن شاعری کی ایک اہم خصوصیت جس کا تذکرہ اوپر آچکا ہے انانیت ہے جس کا اظہار ان کی شاعری میں نئے انداز اور نئے ڈھنگ سے ملتا ہے۔

غالب کی زندگی اور ماحول کا جائزہ لیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ غالب کی طبیعت میں انانیت اور خودی کا جذبہ پیدا ہونے کی کئی وجوہات ہیں لیکن جیسا کہ میں اس سے قبل اظہار رائے کرچکا ہوں ان میں سب سے اہم احساس غم ہے اس میں شک نہیں کہ غم کی معجز نمائی اکثر فکر انسانی کو نہ صرف بلندیوں اور رفعتوں کی سیر کراتی ہے بلکہ بعض وقت اس بلند مقام تک پہنچا دیتی ہے جہاں پر سکون زندگی کے وسائل کبھی نہیں پہنچا سکتے۔ اور یہ مشاہدہ ہے کہ بیشتر اچھے اور بڑے فنکار غم کی بھٹی میں ہی تپ کر اہل فکر و نظر بنتے ہیں۔ نطشے بھی یہی کہتا ہے۔ "All progressive is the spritualisation of pain"

برنارڈ شاہ کا قول ہے

"محض احمق آدمی خوش رہنا چاہتے ہیں"۔ شوپنہار نے بھی اپنے فلسفہ غم سے ہی فکر انسانی کو آفاقی بصیرت عطا کی ہے اور یہی حال غالب کے غم کا ہے جس کا نقش اوّل اس کی انانیت ہے دیگر اسباب وعوامل جو غالب کے جذبۂ خودی ابھارنے کا سبب بنے وہ غالب کا اپنا احساس اعلےٰ حسب ونسب اور امیرانہ ماحول کی پرورش ہے۔

خودی یا انانیّت کا لفظ اردو میں غالب تک محدود معنی میں استعمال ہوتا تھا جس کے معنی تکبّر اور غرور کے لئے جاتے تھے مگر جس شاعر نے سب سے پہلے انسانی خودی کے اثبات پر اقبال سے قبل زور دیا وہ غالب ہیں غالب نے لفظ خودی کو نئے معنے دیئے ہیں جس کا مقصد کبر و تکبّر نہیں ہے بلکہ واقفیتِ ذات ہے اقبال

نے اسے فلسفیانہ اصطلاح کے طور پر بے حد وسیع معنی میں استعمال کیا ہے اور وہ اسے ذریعۂ "عرفانِ ذات" سمجھتا ہے غالب کی انانیت وہ ہے جو حفظِ مراتب کا خیال بھی رکھتی ہے اور حقوقِ بشریت کا تحفظ بھی کرتی ہے بلکہ جہاں ممکن ہو ان سے پورے استفادہ کی کوشش بھی کرتی ہے چنانچہ غالب اپنی وضعداری اپنی شاعری اظہار واردات حسن وعشق اور بارگاہِ ذات حقیقی میں اپنے عجز و نیاز کے باوجود ایک وقار، تمکنت اور خود اعتمادی کا خیال رکھتے ہیں اور اُن کا یہ دستور انہیں یقیناً دیگر شعرا سے بلند و برتر کر دیتا ہے۔

اردو غزل میں محبوب کے سراپا اور اس کی صفات و عادات کا تذکرہ اس طرح کیا جاتا رہا ہے کہ عاشق کی حیثیت محبوب کے سامنے ایک نیاز مند عاجز اور بے بس انسان کی سی رہ جاتی ہے اور اسے یہ تب و تاب اور ہمت و حوصلہ نہیں ہوتا کہ محبوب کے ظلم، زیادتیوں، وعدہ خلافیوں اور بے اعتنائیوں کا گلہ شکوہ تو کجا اپنی زبان پر حرفِ شکایت بھی لا سکے۔ مگر غالب نے اس شعری چلن کو بڑی حد تک بدل دیا۔ ان کے نزدیک محبت پاشکستگی اور افسردگی کا جذبہ پیدا نہیں کرتی بلکہ آنکھوں کو وہ بصارت اور دل کو وہ بصیرت عطا کر دیتی ہے جس سے انسان کو اپنے صحیح مرتبہ اور مقام کا عرفان حاصل ہو جاتا ہے اور یہ عرفان اس کے ہر شعبۂ زندگی میں قدم قدم پر راہنمائی کرتا ہے۔ جس سے عمل میں حسن بھی پیدا ہو جاتا ہے اور کردار میں سلیقہ بھی۔

غالب وارداتِ حسن و عشق میں بھی ایک عاشق کو مجبور محض دیکھنا گوارا نہیں کرتے بلکہ اسے عشق و محبت کے ادب و آداب کے ساتھ ایک نگاہ خود آگاہی بخشتے ہیں۔ اُن کے نزدیک اگر محبوب "عجز و نیاز" سے بھی نظر التفات پر آمادہ نہ ہو۔ تو اس سے شکایت بھی کی جا سکتی ہے اس کا دامن بھی حریفانہ کھینچا جا سکتا ہے۔ اور جب وہ اپنی بے اعتنائی اور بے توجہی سے گریز پا ہونے اور رقیب نوازی ترک کرنے کے لئے تیار نہ ہو تو اس سے "یک سر" بن کر ناراضی کا سبب پوچھنا اور خود کو اس کے امتحان میں ڈالنا بھی عاشق کی خودی کے منافی ہے۔ چنانچہ غالب جب حریم ناز میں داخل ہوتے ہیں تو بڑی آن بان کے ساتھ داخل

ہوتے ہیں اور اپنے مقام کا خیال ہر لحاظ سے روا رکھتے ہیں ان کی شخصیت کی انفرادیت وہاں بھی جلوہ ریز ہوتی ہے بلکہ بقول رشید احمد صدیقی "ان کا بس چلے تو اپنے ناز وہ محبوب سے اٹھوائیں۔"

مگر حقیقت یہ ہے کہ ان کا کچھ بس چلتا ہے اور کچھ نہیں اور جہاں تک بس چلتا ہے اس سے بطریق احسن استفادہ کرنے سے نہیں ہچکچاتے۔

عجز و نیاز سے تو نہ آیا وہ راہ پر
دامن کو اس کے آج حریفانہ کھینچئے

٭

وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں بدلیں
سبک سر بن کے کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو

٭

گئی وہ بات کہ ہو گفتگو تو کیوں کر ہو
کہے سے کچھ نہ ہوا پھر کہو تو کیونکر ہو!

٭

یہی ہے آزمانا تو ستانا کس کو کہتے ہیں
عدو کے ہو لئے جب تم تو میرا امتحاں کیوں ہو

٭

غالب کے یہاں انسانی عظمت اور بشریت کا ایسا بے باک اور جرأت مندانہ تصور بھی ملتا ہے جو بندگی اور بندہ نوازی میں مقامات رسم و راہ کا تعین کر دیتا ہے غالب اس مرکز حسن و جمال سے اپنی انجمن دل کی تزئین و آرائش کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ جس کے سبب عجز و نیاز کی کرنیں پھوٹتی اور پھیلتی ہیں لیکن ان کے عجز اور خود سپردگی میں نیاز مندی سے زیادہ ہوشمندی ہوتی ہے۔ وہ بارگاہِ ایزدی میں جب مناسب سمجھتے ہیں شکوہ و شکایت بھی کر لیتے ہیں لیکن خود سر نہیں ہوتے غالب سے قبل اردو شاعری میں جہاں کہیں عبد و معبود کے رشتہ کا اظہار کیا گیا ہے وہاں

عبد کو بہر صورت گناہ گار، شرمسار عاجز اور مجبور محض دکھایا گیا ہے۔ اس کی زندگی کو حباب آسا اور اس کائنات کو ایک نقش موہوم گردانا گیا ہے جس کا اظہار میرؔ نے بھی بڑے پُرسوز اور پُر اثر انداز میں کیا ہے۔

ہستی اپنی حباب کی سی ہے
یہ نمائش سراب کی سی ہے

ث

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہِ شیشہ گری کا!

ث

اس احساس پاشکستگی کو وحدۃ الوجود اور ہمہ اوست کے تصوّر نے بھی بڑی حد تک تقویت پہنچائی۔ مگر غالب کا انسان وہ انسان ہے جس کی جناب میں معبودِ حقیقی کو "گستاخی فرشتہ" بھی پسند نہیں۔ جو یہ حق رکھتا ہے کہ اپنے خالق سے بیباکانہ اظہار خیال کر سکے۔ وہ بندگی میں بھی اس قدر "آزاد و خود بین" نظر آتا ہے کہ درِ کعبہ وا نہو تو کھلنے کا انتظار، اپنے بشری حقوق کے منافی سمجھتا ہے اور واپس لوٹ آتا ہے، وہ عفو گناہی کے لیئے جبیں سائی اور لجاجت کو اپنی خودی کے خلاف سمجھتا ہے۔

——— اس کے نزدیک صرف احساس شرمندگی ہی کافی ہے لیکن وقت بندگی میں بھلا ہوتا نظر نہیں آتا۔ تو اس کا لب و لہجہ طنزیہ بھی ہو جاتا ہے لیکن کافرانہ نہیں ہو پاتا ——— کبھی باتوں باتوں میں یہ بھی کہہ دیتا ہے کہ وہ فرشتے جنہیں قرب الہٰی حاصل ہے انہیں انسان سے کیا ہمدردی ہو سکتی ہے جو چاہتے ہیں لکھ لیتے ہیں اور پھر اس نوشتۂ اعمال پر انسان کو سزا دے دی جاتی ہے انسان سے ہمدردی اور اس کے حقوق کی نگہداشت اگر کوئی کر سکتا ہے تو وہ اس کا ہم جنس یعنی انسان ہی ہو سکتا ہے جو بوقت تحریر موجود نہیں ہوتا ——— پھر یہ کس طرح درست تسلیم کر لیا جائے۔ کہ وہ فرشتوں کا خود نوشتہ اعمال نامہ بلا عینی گواہ

انصاف کے تقاضوں کو پورا کرتا ہے اور انسان کو سزا دلانے کے لئے کافی ہے بندہ نوازی کی شان بھی وہ اس میں سمجھتا ہے کہ بندہ کو بلا مانگے دیا جائے جبکہ وہ عالم الغیب ہے اور انسان کی خواہشات اور ضروریات کو بخوبی جانتا اور سمجھتا ہے۔

غالب کا انسان اپنے خالق سے دونوں جہاں لے کر بھی خوش ہوتا نظر نہیں آتا لیکن اس قدر بے ادب بھی نہیں کہ بارگاہ ایزدی میں آمادۂ تکرار ہو جائے اس ضمن میں غالب کے مندرجہ ذیل اشعار پیش ہیں۔

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود بیں ہیں کہ ہم
الٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا!

☆

رحمت اگر قبول کرے کیا بعید ہے
شرمندگی سے عذر نہ کرنا گناہ کا!

☆

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی
بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

☆

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

☆

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

☆

بے طلب دیں تو مزا اس میں سوا ملتا ہے
وہ گدا جس میں نہ ہو خوئے سوال اچھا ہے

دونوں جہان دے کے وہ سمجھا یہ خوش رہا
یاں آپڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں

ٌ

گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلی نہ طور پر
دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

ٌ

غالب کا انسان اپنی صلاحیتوں کا اس قدر شدید احساس رکھتا ہے کہ خود کو پیغمبروں سے بھی کسی طرح کمتر نہیں سمجھتا ——— حتّےٰ کہ ان کی پیروی کرنا بھی گوارا نہیں کرتا۔ ہاں! موقع مل جائے تو ان کو بھی نصیحت کر دیتا ہے اور چھیڑ چھاڑ کر لیتا ہے۔

ابنِ مریم ہوا کرے کوئی
مرے دکھ کی دوا کرے کوئی

ٌ

لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں
مانا کہ اک بزرگ ہمیں ہمسفر ملے

ٌ

اِک کھیل ہے اورنگِ سلیماں مرے نزدیک
اک بات ہے اعجاز مسیحا مرے آگے

ٌ

وہ زندہ ہم ہیں کہ روشناسِ خلق اے خضر
نہ تم کہ چور بنے عمرِ جاوداں کے لئے

ٌ

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب
آؤ نا ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی!

غالب کا انسان وجود کائنات کا سبب محض اپنی ذات کو سمجھتا ہے۔ اس لئے وہ کائنات کی اشیاء اور اس میں جلوہ ریز مظاہر فطرت کو بھی اپنے سے برتر نہیں گردانتا۔

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشہ مرے آگے
جز نام نہیں صورتِ عالم مجھے منظور
جز وہم نہیں ہستئ اشیاء مرے آگے

ہوتا ہے نہاں گرد میں صحرا مرے ہوتے
گھستا ہے جبیں خاک پہ دریا مرے آگے

غالب کا انسان بڑا احساس ہے اپنی خودی کی خاطر دوسرے کا احسان اٹھانا پسند نہیں کرتا وہ جانتا ہے کہ اس سے انسان کی اَنا مجروح ہو جاتی ہے اور جب اَنا مجروح ہو جائے تو نہ ارادہ میں استقامت باقی رہتی ہے اور نہ عمل میں توانائی۔ اسی لئے غالب کہتے ہیں۔

صد جلوہ رُو برو ہے جو مژگاں اُٹھائیے
طاقت کہاں کہ دید کا احساں اُٹھائیے
دیوار بارِ منتِ مزدور سے ہے خم
اے خانماں خراب! نہ احساں اٹھائیے

ؔ

درد منّت کشِ دوا نہ ہوا
میں نہ اچھا ہوا بُرا نہ ہوا

ؔ

غالب کو اپنے فن شعر و ادب پر بڑا ناز تھا اور وہ خود کو بہت سے شاعروں سے بلند و برتر سمجھتے تھے جس کا اظہار نظم و نثر دونوں میں ملتا ہے اور یہ کوئی باعث شرم بات نہیں یہ عام مشاہدہ ہے کہ انانیت کا جذبہ ہمیشہ بڑے اور اعلے

فنکاروں میں بیشتر پایا جاتا ہے بلکہ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ جس قدر فن کار بلند ہوتا ہے۔ اسی قدر اس میں برتری کا جذبہ زیادہ ابھرتا ہے میرؔ کو بھی اپنی زبان اور شاعری پر بڑا ناز تھا۔

گفتگو ریختہ میں ہم سے نہ کر
یہ ہماری زبان ہے پیارے

ؐ

جانے کا نہیں شور سخن کا مرے ہرگز
تا حشر جہاں میں مرا دیوان رہے گا

ؐ

غالبؔ نے بھی اپنے جہانِ شعر و ادب کی تزئین و آرائش اپنے جذبہ و فکر کی چمک دمک، نرالے خیالات اور انوکھے انداز بیان سے کی ہے۔ جس کا احساس انہیں پوری طرح تھا اور اس کا اظہار بھی بے حد پسند تھا — وہ اپنے خطوط میں جا بجا لکھتے ہیں " شاعری معنی آفرینی ہے قافیہ پیمائی نہیں —" ایک خط میں سیّد محمد عباس کو لکھا ہے۔

" کلام کی حقیقت کی داد چاہتا ہوں ——————
—— طرزِ عبارت کی داد چاہتا ہوں نگارش لطافت سے خالی نہ ہوگی گذارش نطافت سے خالی نہ ہوگی .... مبداء فیاض کا مجھ پر احسان عظیم ہے ماخذ میرا صحیح اور طبع میری سلیم ہے"

غالبؔ یہ بخوبی جانتے تھے کہ اچھے اور پُر اثر شعر کی ساخت " دل گداختہ اور سوزشِ دل " سے ہی ہو سکتی ہے جس سے لب و لہجہ میں وہ کیف و مستی پیدا ہو جاتی ہے۔ کہ غیب سے مضامین خیال میں آنے لگ جاتے ہیں اور اپنے دل کی بات حدیث دیگراں بن جاتی ہے۔

فکر و فن کا یہی وہ مقام ہے۔ جب ایک شاعر دیگر شعراء کے مقابلہ میں ممتاز ہو جاتا ہے اور اس کی شاعری چشم بینا اور ذہن رسا کے لئے گنجینۂ معنی کا

طلسم" ہوجاتی ہے ایسی شاعری اور "انداز بیان" پر اگر کوئی شاعر خود کو دیگر شعراء سے ممتاز سمجھے تو اسے کبر وغرور نہیں کہا جاسکتا۔ غالبؔ خود کو سب شعراء میں نہ کامل ترین سمجھتے ہیں۔ اور نہ قوانین قدرت کو قبول کرنے سے انکار کرتے ہیں۔ یہ ضرور ہے دوسروں کے مقابلہ میں اپنا جائز مقام متعین کرنا بھی اپنا حق سمجھتے ہیں۔

حسن فروغ شمع سخن دور ہے اسدؔ
پہلے دل گداختہ پیدا کرے کوئی!

لکھتا ہوں اسدؔ سوزش دل سے سخن گرم
تا رکھ نہ سکے کوئی مرے حرف پہ انگشت

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالبؔ صریر خامہ نوائے سروش ہے

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھئے
جو لفظ کہ غالبؔ مرے اشعار میں آوے

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالبؔ کا ہے انداز بیاں اور!

گر شعر و سخن بدہر آئین بودے
دیوان مرا شہرت پروین بودے
غالبؔ اگر این فن سخن دین بودے
آں دیں را ایزدی کتاب ایں بودے

غالبؔ اپنے پیشرو اردو شاعروں میں جس سے متاثر معلوم ہوتے ہیں وہ میر تقی میرؔ ہیں

وہ بقول ناسخ "معتقد میر" بھی ہیں اور ان کے فن شعر کے بھی قائل لیکن خود کو بھی ریختہ کا استاد ہی سمجھتے ہیں۔

ریختے کے تمہیں استاد نہیں ہو غالبؔ
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا!

غالبؔ نے اپنے ہم عصروں میں ذوقؔ کو کبھی اچھا اور بڑا شاعر نہیں سمجھا اور حقیقت بھی یہ ہے کہ ذوقؔ خود کو دربار کی فضا اور روایتی شاعری سے علیحدہ نہ کر سکے۔ غالبؔ نے اُن کے مرنے پر صرف ان کی ذاتی خصوصیات کا ہی تذکرہ کیا ہے

منشی نبی بخش کو لکھتے ہیں ——— "سچ تو یہ ہے کہ یہ شخص اپنی وضع کا ایک اور اس عصر میں غنیمت تھا۔"

لیکن مومنؔ کے انتقال پر غالبؔ نے ان کی شاعری پر بھی اظہار رائے کیا ہے۔ لکھتے ہیں ——— "یہ شخص بھی اپنی وضع کا اچھا کہنے والا تھا۔ طبیعت اس کی معنی آفرین تھی"

یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ غالبؔ نے الفاظ "اپنی وضع" استعمال کئے ہیں جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ غالبؔ کی وضع علیحدہ تھی اور وہ اس وضع کا اچھا کہنے والا نہیں تھا غالبؔ کی رائے دونوں محولہ بالا شعراء کے متعلق جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں اور اس سے قبل اظہار رائے بھی کیا ہے۔ بڑی حد تک درست ہے۔

غالبؔ کی شاعری کی دوسری اہم خصوصیت جدت پسندی ہے۔ اس جدت پسندی سے یہ مراد نہیں ہے۔ کہ غالبؔ نے اردو شاعری میں کسی جدید صنف شاعری کی طرح ڈالی ہے۔ یا کوئی نئی ڈگر اور نیا راستہ تلاش کیا۔ غالبؔ صورت و ہیئت کے اعتبار سے اردو شاعری میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکے۔ مگر اس کی سیرت اور مزاج بدلنے میں ضرور کامیاب ہوئے غالبؔ نے روایتی انداز تحریر اور ڈھلے ڈھلائے فرسودہ خیالات سے بغاوت کی۔ تشبیہ و استعارہ کی غرابت۔ پیچیدگی اور ان کی بھول بھلیوں سے راہ فرار اختیار کی وہ معاملہ بندی جو اردو شاعری کی رگ و پے میں جذب ہو گئی تھی اس سے مناسب حد تک کنارہ کش ہو گئے۔ جس سے اردو شاعری میں ایک تازگی اور شادابی بھی پیدا ہو گئی اور حقیقت پسندی اور جرأت مندی بھی جس نے آگے چل کر نئی زندگی کے امکانات اور آنے والے عہد کی نشاندہی کی۔

صنف غزل ——— غالبؔ کی سب سے زیادہ منظورِ نظر رہی ہے۔ ویسے یہ تذکرہ پہلے

آچکا ہے۔ کہ غالب نے دوسری اصناف سخن سے گریز اختیار نہیں کیا۔ ان میں بھی طبع آزمائی کی۔ اور جدّت پیدا کرلی۔ لیکن غزل کا مزاج غالب کی طبیعت کے عین مطابق تھا اور یہی اس وقت صنف شاعری میں حدیث دل کے اظہار کا مقبول ترین ذریعہ تھی۔ غالب کی جدّت یہ ہے۔ کہ وہ احساسات اور کیفیات جو وقت اور سماج نے ان کے دل و دماغ پر مرتب کئے ان کا اظہار بڑی بیباکی اور چابکدستی کے ساتھ اس طرح شعر میں کردیا ہے۔ کہ نہ صرف غزل کا شعور اور شریعت بدل گئی۔ بلکہ اس میں ہر دل کو اپنی دھڑکن محسوس ہونے لگی اور اس دھڑکن کے ہمہ گیر احساس نے غالب کی شاعری کو آفاقیت عطا کردی۔

خود کہتے ہیں۔

دیکھنا تقریر کی لذّت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

غالب اور دیگر شعراء اردو کے مسلک میں سب سے بڑا اور نمایاں فرق یہ ہے کہ غالب فارسیت کے دلدادہ تھے۔ اس لئے ان کے سامنے فارسی گو شعرا تھے۔ اردو شعرا کی حد نظر صرف دلی تک تھی۔ یہی وجہ ہے۔ کہ غالب نے اپنے ابتدائی دور کی شاعری میں بجائے اردو کے فارسی گو شعرا کی تقلید کی۔ ان کی ابتدائی اردو شاعری میں بیدل کے انداز اور تیور صاف نظر آتے ہیں چنانچہ اس عہد کی شاعری میں فارسی تراکیب فارسی انداز بیان اور خیال بندی کی اس قدر بھرمار ملتی ہے۔ کہ شاعری میں بے رنگی اور بے کیفی پیدا ہوگئی ہے لیکن تھوڑے عرصہ بعد ہی غالب نے اس روش کو یہ کہہ کر ترک کردیا۔

طرز بیدل میں ریختہ کہنا
اسداللہ خاں قیامت ہے

لیکن اب غالب نے عرفی کی طرز، نظیری کے رنگ اور دیگر فارسی گو شعراء کے انداز تو کو اپنانا شروع کردیا۔ جس سے غالب کے ذہن نے بہت کچھ تجربہ حاصل کیا۔ لیکن وہ نیاپن پیدا نہ ہوسکا جس کی متلاشی غالب کی افتاد طبع اور جدّت پسندی تھی۔ اور ان کی شاعری بدستور معرّیٰ رہی —— اس صورت حال کا اظہار بھی غالب نے خود ہی کیا ہے — جو درج ذیل ہے۔

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں ـــــ!

مگر جیسا کہ میں پہلے بھی تحریر کر چکا ہوں وقت کے ساتھ ساتھ جیسے جیسے غالب کے مشاہدے اور تجربے میں اضافہ ہوتا گیا اور دوست احباب کی مناسب اور بروقت تنقید کا اثر غالب کے ذہن اور مزاج پر ہوا۔ ان کی شاعری میں انفرادیت کا رنگ ابھرتا گیا اور ایک وقت وہ آگیا۔ کہ انداز بیان میں نرالی شان پیدا ہو گئی۔

غالب نے اپنے خیالات اور جذبات کے اظہار کے لئے اردو غزل میں نئے اسالیب تراشے جن میں جدت تخیل بھی موجود ہے۔ اور تشبیہات و استعارات کی جلوہ گری بھی ـــ!۔ مگر یہاں یہ بات نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ کہ غالب نے فارسی سے اس وقت بھی بالکل قطع تعلق نہیں کیا تھا بلکہ فارسی کے تصرف سے ایسی نادر تشبیہات اور استعارات وضع کرلئے کہ اس کے بیان میں ایمائیت اور رمزیت کے ساتھ ساتھ ایک حسن اور معنی آفرینی پیدا ہو گئی جو غالب تک اردو شعراء کو حاصل نہ ہو سکی تھی۔ غالب سے قبل اردو شاعری میں فارسی شاعری کے اثر سے استعارات و تشبیہات کی جو تکنیک موجود تھی وہ تقریباً زلف کو دام "حنا کو خون" ابرو کو کمان، مژہ کو سنان، چشم کو نرگس، دنداں کو دُر اور منہ کو غنچہ کہنے تک محدود تھی جس سے اردو شاعری میں عموماً اور غزل میں خصوصاً بے جان اور کھوکھلی رومانیت پیدا ہو گئی تھی مگر غالب نے اپنی اجتہاد فکر سے حلقۂ صد کام نہنگ، موج نگاہ، گنجینۂ معنی کا طلسم۔ دام شنیدن محشر خیال، جنت نگاہ، فردوس گوش، شیرازہ مژگاں، آئینہ باد بہاری۔ خمار رسوم، دیدۂ ساغر، متاع دست گراں، طوطی بسمل، صد دل عشاق، حنائے پائے خزاں جیسی نادر تشبیہات و استعارات کو اردو غزل میں داخل کر کے اس کی زبان و بیان میں انوکھا پن پیدا کر دیا۔ غالب کے بیان کا یہی نیا پن ہے۔ کہ اگر کوئی ناقد ان کے خیالات اور شخصیت سے متاثر نہیں ہو پاتا اب بھی ان کے انداز بیاں سے ضرور متاثر ہوتا ہے۔ اور ان کی تعریف کئے بغیر نہیں رہ پاتا۔

غالب نے اپنی جدت پسندی سے اردو غزل میں جو موضوع اور مواد کے اعتبار سے تنگی محدود سمجھی جاتی تھی۔ ایسی وسعت پیدا کر دی ہے۔ کہ اس میں اب معاشرے کے ہر احساس اور زندگی کی ہر جہت کا اظہار بخوبی کیا جا سکتا ہے ـــــ اور وہ کہنے کو تو یہ کہہ گئے ہیں کہ ؎

بقدر ذوق نہیں ظرف تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کیلئے

مگر حقیقت یہ ہے کہ غالب جو کچھ کہنا چاہتے تھے۔ وہ سب اپنی اردو غزل میں کہہ گئے ہیں اس میں واردات حسن و عشق بھی ہے۔ سوز و گداز بھی، تصوف بھی، رندی و مستی بھی۔ شوخی اور شگفتگی بھی —— تہذیب کی عکاسی بھی۔ زاہد و رند کی چھیڑ چھاڑ بھی اور اس کے ساتھ ساتھ جذبات کی معجز نمائی بھی اور خیالات کی جلوہ گری بھی فکر کی گہرائی بھی موجود ہے اور فن کا کمال بھی۔ وقت کے تقاضے بھی ہیں زندگی کے مطالبے بھی۔ اور روح عصر کی نمائندگی بھی۔ جس سے غالب کی غزل میں آفاقیت اور ہمہ گیری پیدا ہو گئی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ غالب کو اپنے دور میں وہ بلند مقام حاصل نہ ہو سکا جس کے وہ مستحق تھے۔ اور انہیں اس کا بجا طور پر شکوہ رہا۔ مگر ان کی روشن ضمیری ان کے فن شعر و نغمہ کی قدر مستقبل قریب میں ہونے کا برابر یقین دلاتی رہی۔ جو آج حقیقت بن کر ہمارے سامنے آرہی ہے۔

کوکبم را در عدم اوج قبولے بودہ است
شہرت شعرم بہ گیتی بعد من خواہد شدن!

ہم یہاں غالب کے اشعار ہر موضوع اور جدت خیال و بیان کی تائید میں پیش کرنا محض طوالت سمجھتے ہیں کیونکہ غالب کے کلام کی خوبیاں بڑی حد تک منظر عام پر آ چکی ہیں اور مولانا حالی —— ڈاکٹر عبدالرحمان بجنوری اور دیگر کئی اصحاب فکر و نظر ان کے کلام کے مختلف موضوعات پر بڑی وضاحت سے روشنی ڈال چکے ہیں۔ جس کے بعد مزید اضافے اور خاطر خواہ نتائج برآمد ہونے کی گنجائش نظر نہیں آتی ——

مگر —— اس قدر لکھنا یقیناً درست ہوگا۔ کہ یہ غالب کا ہی کارنامہ ہے کہ انہوں نے نہ صرف اردو غزل میں علم و آگہی کے نئے افق تلاش کئے بلکہ ان کی سمتوں کو وقت کے تقاضوں کے مطابق بڑے سلیقے سے متعین کیا۔ جس سے غزل میں زیبائی اور رعنائی کے ساتھ ساتھ وسیع المشربی پیدا ہو گئی۔ ع

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور

اگر ان کے کلام میں یہ وسیع المشربی پیدا نہ ہوتی تو آج اردو غزل کی وہ شکل وصورت کبھی نہ ہوتی جو ہم دیکھتے ہیں اور نہ ہی غالب کے بعد آنے والوں میں اکبر۔ حسرت اقبال اور فیض اردو غزل کے بلند قامت شاعر ہو پاتے۔

خطوطِ غالبؔ میں ظرافت[1]

غالبؔ نے ایسا ذہنِ رسا اور اندازِ فکر پایا تھا۔ کہ جہاں اُس نے اردو شاعری کو نئی زندگی، نیا انداز اور نئی بصیرت عطا کی وہاں اردو نثر میں بھی اس کے مزاج کی شوخیٔ طبیعت کے بانکپن اور انداز کے انوکھے پن نے اس کی شخصیت کو یکتائے روزگار کر دیا۔ اردو نثر میں غالبؔ کی اولیت اور ہمہ گیری اس کے شگفتہ اور جاذبِ نظر خطوط کی وجہ سے ہے۔ اس میں شک نہیں کہ نجی خطوط ہی ایک ایسا ذریعہ ہو سکتے ہیں جن سے کسی انسان کی شخصیت اور مزاج کا صحیح اندازہ لگایا جا سکے قطع نظر درباری اور کاروباری خطوط کے۔ وہ خطوط جو دوست احباب اور اعزا کو لکھے جاتے ہیں ان میں لکھنے والا اپنے وہ تمام حالات اور کیفیات جو اس کے ذہن و مزاج پر اثر انداز ہوتی ہیں اور وہ محسوس کرتا ہے۔ بغیر کسی تکلف و تصنع کے صاف صاف بے کم و کاست زبانِ قلم سے بیان کر دیتا ہے اسے نہ تو یہ ڈر ہوتا ہے۔ کہ اس پر کوئی تنقید ہو گی۔ نہ یہ خیال کہ اس کا مذاق اڑایا جا سکے گا۔ اور نہ یہ فکر کہ اس کی اپنی زندگی ماسوائے مکتوب الیہ کے کسی دیگر شخص کے سامنے ظاہر ہو سکے گی۔ کیونکہ انسان بہت سی باتیں معاشرہ کی پابندیوں خاندانی وجاہت اور مذہبی قیود کی بناء پر ہر کس و ناکس کے سامنے بیان کرنا پسند نہیں کرتا۔ اس لئے خطوط ہی سے کسی مکتوب نگار کے دل کی صحیح دھڑکن طبیعت کی وارفتگی، ماحول کے اثر اور مزاج کی افتاد کا صحیح اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اور اس طرح اس کی شخصیت نکھری ہوئی جیتی جاگتی ہمارے سامنے آ جاتی ہے۔

کسی شاعر یا مصنف کے خطوط اس لئے اور بھی جاذبِ نظر اور لائقِ توجہ ہوتے ہیں کہ ان سے

---

[1] نقوش، غالب نمبر فروری ۱۹۶۹ء

اس کی ذات اور ماحول کے صحیح اور واضح نقوش ابھرتے ہیں جس سے اس کے ادب کو سمجھنے اور سمجھانے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ غالب کے خطوط کے بارے میں مولوی عبدالحق صاحب کی یہ رائے بڑی مناسب ہے۔

"مرزا غالب کے حالات اور کلام پر بہت سی کتابیں اور مضامین لکھے گئے ہیں مگر کہیں ان کی زندگی اور سیرت کا وہ نقشہ نظر نہیں آتا۔ جو ان کے رقعوں میں ہے۔ ان رقعوں میں عجیب وغریب شخص نے اپنی روح بھر دی ہے۔"

اردو میں ظرافت کی ابتداء انیسویں صدی سے قبل ہو چکی تھی مگر اس کی نکھری ہوئی اور بنی سنوری صورت ہمارے سامنے غالب کے شعر وادب میں نظر آتی ہے۔ مگر اردو ادب میں اس صنفِ لطیف کی ابتداء کا سہرا غالب ہی کے سر ہے۔ غالب سے قبل اردو شعر وادب میں طنز و ظرافت کا ایسا سرمایہ نہیں ملتا۔ جس میں وہ سلیقہ مندی، ہوشمندی اور رکھ رکھاؤ موجود ہو جو کہ غالب کی ظرافت اور طرز تحریر کی جان ہے۔ اس ادب میں طنز وظرافت کے ساتھ ساتھ پھکڑ پن فحاشی اور زہرناکی بھی بڑی حد تک پائی جاتی ہے اور اس کی وجہ یہ ہو سکتا ہے کہ اس وقت تک اردو ادب میں فکر ونظر کی وہ بالیدگی، گہرائی اور گیرائی پیدا ہی نہیں ہوئی تھی جو طنز و ظرافت، تمسخر، پھکڑپن اور فحاشی میں کوئی واضح حد یا قرینہ متعین کر سکتی مگر غالب طنز و ظرافت کے حدود سے آگے قدم نہیں رکھتے ان کی ظرافت انتہائی پاکیزہ، صحتمند اور لطیف ہے۔ اس میں رکاکت، تلخی اور کینہ پروری نام کو نہیں ــــــ

بعض اہل نظر اب بھی ظرافت کو اردو ادب میں وسیع معنی پہنانے کی کوشش کرتے ہیں اور وہ اس کے ذیل میں طنز و مزاح، تمسخر، پھکڑپن اور فحاشی وغیرہ کو بھی شامل کر دیتے ہیں مگر میرے نزدیک ان میں سے ہر ایک کے علیحدہ راستے اور علیحدہ حدود ہیں۔ بلکہ ان کے انسانی ذہن ومزاج پر وار کرنے اور اثر ڈالنے کا طریقہ اور دستور بھی جُدا جُدا ہے۔ میں تو ظرافت کی حد اس کیفیت انسانی کو سمجھتا ہوں جب ہونٹ ایک مقررہ حد سے کبھی کچھ یا کبھی کچھ سے تھوڑے ہی زیادہ آگے کی طرف بڑھ تو جائیں مگر شمالاً جنوباً اس طرح نہ پھیلیں کہ چوڑائی کی حدود میں اضافہ ہو جائے۔ حلق اور ناک بالکل پرسکون رہیں چہرہ پر تازگی پیدا ہو جائے اور آنکھوں میں چمک دل ایک کیف سا محسوس کرے اور دماغ ایک لطیف خوشی ــــــ مگر کوئی جذبہ نہ ابھرے۔ جسے اہل زبان مسکرانے یا ہنسنے سے تعبیر کرتے ہیں اور طنز اسے جس کا براہ راست اور بلا واسطہ حملہ دل و

دماغ پر ہو جو دل پر نشتر لگا کر معمولی سی چبھن اور کسک پیدا کر دے۔ ساتھ ہی دماغ کو کچھ سوچنے اور سمجھنے کی دعوت دے۔ ماتھے پر کبھی شکن پڑ سکتی ہے لیکن آنکھیں پُرنم نہیں ہوتیں جس کا مقصد زندگی کے کسی پہلو کو اجاگر کرنا یا معاشرہ یا کسی فرد کی اصلاح ہو۔ مگر اس مقصد کا اظہار بڑے غیر جانبدارانہ طور پر بلا ذاتی عناد و تعصب کیا جائے۔ اس میں نا ناصحانہ انداز ہو، نہ مشفقانہ اور نہ خطیبانہ۔

ظرافت اور تمسخر میں وہی فرق ہے جو تبسم اور قہقہہ میں —— قہقہہ وہ جس میں منہ کا دہانہ ہر سمت پھیل جائے۔ اور حلق اور ناک کا تال و سُر بھی شامل ہو جائے۔ پھکڑ یا فحاشی کا اندازہ اس کیفیت سے لگایا جا سکتا ہے۔ جب بچہ اپنے سے بڑے ہمجولی سے پٹے۔ اور مدافعانہ قوت سے خود کو عاری سمجھ کر بے ساختہ منہ سے کچھ کا کچھ بکنے لگے

اس میں ذاتی عناد بھی ہوتا ہے اور کمینگی بھی۔ اس سے زیادہ سے زیادہ بلیک میل ہی کا کام لیا جا سکتا ہے۔ اور بس —— مگر غالب اپنے خطوط میں جو بات کہتے ہیں وہ ہنس کر اور مسکرا کر کہتے ہیں کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا ہے۔ کہ مسکراہٹ میں ہلکی سی نشتریت اور مقصدیت چھپی ہو مگر قہقہہ نہیں ہوتا اور نہ پھکڑ پن۔ اس لحاظ سے غالب کے ہاں ظرافت زیادہ اور طنز کم ہے۔ اور تمسخر بالکل نہیں ایک جگہ پنڈت برج نارائن چکبست اودھ پنچ لکھنو کی ظرافت کو معیاری ظرافت تسلیم نہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں۔

"لطیف ظرافت اور بذلہ سنجی و تمسخر میں بہت فرق ہے اگر لطیف و پاکیزہ ظرافت کا رنگ دیکھنا ہے۔ تو اردو زبان کے عاشق کو غالب کے خطوط پر نظر ڈالنا چاہیئے"

غالب کی اپنی دنیا غم ہائے روزگار کی آماجگاہ تھی۔ وقت اور زمانے نے عہد طفلی کے بعد ہی کوئی ایسا ستم نہ چھوڑا جو اس کی ذات پر آخر دم تک روا نہ رکھا ہو ایسی ستم رسیدہ، غم زدہ اور بے چین زندگی میں ایک انسان رونے اور کراہنے کے سوا کر بھی کیا سکتا ہے۔ جب سسکیاں اور ہچکیاں ہی کسی شخص کا مقدر بن گئی ہوں۔ تو پھر تبسم زیر لبی یا مسکراہٹ کی توقع رکھنا ہی خیال خام نظر آتا ہے۔ مگر غالب ان آہوں اور آنسوؤں کے باوجود ہنستے اور مسکراتے نظر آتے ہیں۔ اور پھر لطف یہ کہ دوسروں پر کم اور خود پر زیادہ —— اور یہ بات انگریزی ادب میں بھی ماسوا چوسر Chouser

کے کسی کو نصیب نہ ہو سکی۔

غالبؔ نے بشیتر خطوط عذر کے بجا ہی لکھے ہیں۔ جب ان کی جوانی کے چل چلاؤ کا وقت تھا۔ ضعیفی میں ویسے بھی انسان کے قوائے ذہن و عمل مضمحل اور کمزور ہو جاتے ہیں۔ دل میں وہ پہلا سا ولولہ رنگینی اور شوخی نہیں رہتی بلکہ اس کی جگہ متین سنجیدگی اور ناصحانہ انداز فکر لے لیتا ہے مگر غم و آلام کی شدت اور عمر کا تقاضہ بھی غالب کی ظریفانہ طبیعت پر کوئی اثر نہ ڈال سکا بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غالب کی شوخی اور ظرافت میں آخر وقت تک روز بروز اضافہ ہی ہوتا گیا۔ درحقیقت غالبؔ فطرتاً ظریف تھے۔ وہ اپنی شوخی اور ظرافت کی پھل جھڑیاں دوسروں کے ذہن و مزاج پر نہ صرف شعر و شاعری اور خطوط ہی میں چھوڑتے نظر آتے ہیں بلکہ ان کی مجلسی گفتگو بھی ایسی شگفتہ، پُر مذاق اور دلچسپ ہوتی تھی۔ کہ محفل کو زعفران زار بنا دیتی تھی پروفیسر رشید احمد صدیقی نے اپنے مخصوص انداز میں مرزا کی ظرافت پر کیا ہی دلچسپ بات کہی ہے۔

"اردو شعر و ادب ہی میں نہیں بلکہ طنز و ظرافت کی محفل میں بھی غالب اس طرح داخل ہوتے ہیں جیسے فلمی گانوں کے درمیان پکے گانے والے کا کوئی استاد وارد ہو ــــ"

غالبؔ کے خطوط کو پُرمذاق۔ دلچسپ اور جاذب نظر بنانے میں جو بات سب سے اہم نظر آتی ہے۔ وہ غالب کی طبعی شوخی اور اندازِ بیان کی بے ساختگی ہے ــــ۔ بقولِ مولانا حالیؔ :۔

"مرزا کی طبیعت میں شوخی ایسی بھری ہوئی تھی۔ جیسے ستار کے تار میں سُر بھرے ہوتے ہیں۔"

غالبؔ کوئی بات کہتے یا لکھتے وقت اپنی طبعی ذہانت اور فطری شوخی سے کوئی نہ کوئی ایسا موقع تلاش کر لیتے ہیں جہاں وہ خود بھی مسکراتے ہیں اور سننے یا پڑھنے والے کو بھی مسکرانے کی دعوت دیتے ہیں۔ مگر ان کی ہنسی بڑی پُراثر اور معنی خیز ہوتی ہے اس میں بے پرواہی قطعی نہیں ہوتی۔

جس کے متعلق ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کی بھی یہ رائے ہے۔

"ان کی مسکراہٹ کسی فریب کا ردِ عمل نہیں ہوتی۔ اُن کے زیرِ لب تبسم نے کبھی قہقہہ

کی شکل نہیں اختیار کی۔ ان کی شوخی ایک معنی خیز تبسم ہے۔"

غالب کے بیشتر خطوط ان کی طبعی ذہانت، ندرت بیان اور فطری شوخی کا گراں قدر ادبی سرمایہ ہیں مگر ہم یہاں بخوف طوالت خطوطِ غالب سے جستہ جستہ اقتباس پیش کرنے پر ہی اکتفا کریں گے۔

ایک خط میں میر مہدی کو لکھتے ہیں۔

میر مہدی! جیتے رہو! آفرین صد ہزار آفرین۔ اردو لکھنے کا کیا اچھا ڈھنگ پیدا کیا ہے۔ کہ مجھ کو رشک آنے لگا ہے۔ سنو ——— دلی کی سب مال و متاع اور زر و گوہر کی لوٹ پنجاب احاطہ میں گئی ہے۔ یہ طرز عبارت خاص میری دولت تھی سو ایک ظالم پانی پت انصاریوں کے محلے کا رہنے والا لوٹ لے گیا۔

ایک خط میں تفتہ سے خط نہ بھیجنے کی شکایت اپنے مخصوص انداز میں اس طرح کرتے ہیں "کیوں صاحب؟ کیا یہ آئین جاری ہوا ہے۔ کہ سکندر آباد کے رہنے والے دلی کے خاک نشینوں کو خط نہ لکھیں ———؟ اگر یہ حکم ہوا ہوتا تو یہاں بھی اشتہار ہو جاتا کہ زنہار ——— کوئی خط سکندر آباد کو یہاں کی ڈاک میں نہ جاوے۔

ایک خط میں علاء الدین خان علائی کے نہ آنے کی کیفیت کا اظہار کس قدر انوکھے انداز میں کیا ہے۔

"لو صاحب وہ مرزا رجب بیگ مرے۔ ان کی تعزیت آپ نے نہ کی شعبان بیگ پیدا ہو گئے۔ کل ان کی چھٹی ہو گئی آپ شریک نہ ہوئے۔"

ایک جگہ علاء الدین احمد خان علائی کو ان کے بچے کی پیدائش کی اطلاع پر خط لکھتے ہیں۔

"میری جان ——— نئے مہمان کا قدم تم کو مبارک ہو اللہ تعالیٰ تمہاری اور اس کی اور اس کے بھائیوں کی عمر و دولت میں برکت دے تمہاری طرز تحریر سے صاف نہیں معلوم ہوتا سعید ہے یا سعیدہ ہے۔ ثاقب اس کو عزیز اور غالب عزیزہ جانتا ہے۔ واضح لکھو تاکہ احتمال دور ہو۔"

امین الدین احمد خان کو ایک جگہ لکھتے ہیں۔"

"خدا نے بھائی ضیاء الدین خان کے بڑھاپے اور میری بے کسی پر رحم فرمایا۔ میرا شہاب الدین خان بچ گیا۔ امراض مختلفہ میں گھر گیا تھا۔ بارے اب من کل الوجوہ صحت حاصل ہے۔ ضعف جاتے ہی جاتے جائے گا۔ آگے کون قوی تھے۔ کہ اب ان کو ضعیف کہا جائے۔ ایک بڈھا کسی گلی میں جاتے جاتے ٹھوکر کھا کر گر پڑا۔ کہنے لگا۔ "ہائے بڑھاپا" ادھر ادھر دیکھا جب جانا کہ کوئی نہیں ——— کہتا ہوا آگے بڑھا کہ ——— "جوانی میں کیا پتھر پڑتے تھے۔"

غالب بعض اوقات اپنی شوخی طبع اور دلنواز انداز بیان سے خطوط میں ایسے دلچسپ مکالمے لے آتے ہیں کہ جن سے ڈرامہ کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔

"اے میرن صاحب ——— السلام علیکم ——— حضرت آداب ——— کہو صاحب آج اجازت ہے میر مہدی کے خط کا جواب لکھنے کی ——— حضور میں کیا منع کرتا ہوں ——— مگر میں اپنے ہر خط میں آپ کی طرف سے دعا لکھ دیتا ہوں ——— پھر آپ کیوں تکلیف کریں، نہیں میرن صاحب ——— اس کے خط کو آئے ہوئے بہت دن ہوئے ہیں وہ خفا ہو رہا ہوگا جواب لکھنا ضرور ہے۔ حضرت! وہ آپ کے فرزند ہیں آپ سے خفا کیوں ہوں گے۔ بھائی آخر کوئی وجہ بتلاؤ۔ تم مجھے خط لکھنے سے کیوں باز رکھتے ہو ——— سبحان اللہ۔ اے لو حضرت آپ تو خط نہیں لکھتے اور مجھے فرماتے ہیں تو باز رکھتا ہے۔ اچھا تم باز نہیں رکھتے مگر یہ کہو کہ تم کیوں نہیں چاہتے کہ میں میر مہدی کو خط لکھوں۔ کیا عرض کروں۔ سچ تو یہ ہے کہ جب آپ کا خط جاتا اور وہ پڑھا جاتا تو میں سنتا اور حظ اٹھاتا۔ اب جو میں وہاں نہیں ہوں تو نہیں چاہتا کہ آپ کا خط جاوے۔ میں اب پنجشنبہ کو روانہ ہوتا ہوں میری روانگی کے تین دن بعد آپ شوق سے لکھئے گا۔ میاں بیٹھو ——— ہوش کی خبر لو ——— تمہارے جانے یا نہ جانے سے مجھے کیا علاقہ ——— میں بوڑھا آدمی بھولا بھالا آدمی ——— تمہاری باتوں میں آ گیا۔ اور آج تک اسے خط نہیں لکھا ——— لاحول ولا قوۃ۔

ایک خط میں اپنے روزہ کا تذکرہ یوں کرتے ہیں۔

"دھوپ بہت تیز ہے۔ روزہ رکھتا ہوں مگر روزہ کو بہلاتا رہتا ہوں کبھی پانی پی لیا کبھی حقہ پی لیا۔ کبھی کوئی ٹکڑا روٹی کا کھا لیا یہاں کے لوگ عجیب فہم رکھتے ہیں۔ میں تو روزہ بہلاتا ہوں اور یہ صاحب کہتے ہیں کہ تو روزہ نہیں رکھتا یہ نہیں سمجھتے روزہ رکھنا اور چیز ہے۔ اور روزہ بہلانا اور بات ہے۔"

ایک خط میں میر مہدی مجروحؔ کو لکھتے ہیں۔

"میاں کس حال میں ہو کس خیال میں ہو کل شام کو میرن صاحب روانہ ہوئے یہاں ان کی سسرال میں، قصّے کیا کیا نہ ہوئے۔ ساس اور سالیوں نے اور بی بی نے آنسوؤں کے دریا بہا دیئے۔ خوشدامن صاحبہ بلائیں لیتی ہیں ـــــ سالیاں کھڑی ہوئی دعائیں دیتی ہیں بی بی مانند صورت دیوار چپ ـــــ جی چاہتا ہے چیخنے کو مگر ناچار چپ، وہ تو غنیمت تھا کہ شہر ویران نہ کوئی جان نہ پہچان ورنہ ہمسائے میں قیامت برپا ہو جاتی۔ ہر ایک نیک بخت اپنے گھر سے دوڑی آئی امام ضامن علیہ السلام کا روپیہ بازو پر باندھا۔ پانچ روپے خرچ راہ دیئے مگر ایسا جانتا ہوں کہ میرن صاحب اپنے جدّ کی نیاز کا روپیہ راہ ہی میں اپنے بازو سے کھول لیں گے۔ اور تم سے صرف پانچ روپے ظاہر کریں گے۔ اب سچ اور جھوٹ تم پر کھل جائے گا۔"

ایک خط میں مرزا حاتم علی بیگ کو جوان کی تصویر کی رسید کے طور پر بھیجا گیا اپنے سراپا کی تصویر بے حد دلچسپ انداز میں یوں کھینچا ہے۔

"بہرحال تمہارا حلیہ دیکھ کر تمہارے کشیدہ قامت ہونے پر مجھ کو رشک نہ آیا کس واسطے کہ میرا قد بھی درازی میں انگشت نما ہے۔ تمہارے گندمی رنگ پر رشک نہ آیا کس واسطے کہ جب میں جیتا تھا۔ تو میرا رنگ چمپئی تھا اور دیدہ ور لوگ اس کی ستائش کرتے تھے۔ اب جو کبھی مجھ کو اپنا رنگ یاد آتا ہے تو چھاتی پر سانپ پھر جاتا ہے۔ ہاں مجھ کو رشک آیا۔ اور میں نے خون جگر کھایا تو اس کلمہ پر کہ داڑھی خوب گھٹی ہوئی ہے۔ .... جب داڑھی مونچھ میں سفید بال آگئے۔ تیسرے دن چیونٹی کے انڈے گالوں پر نظر آنے لگے۔ اس سے بڑھ کر یہ ہوا کہ آگے کے دو دانت ٹوٹ گئے۔ ناچار مسّی بھی چھوڑ دی۔ اور داڑھی بھی ـــــ مگر یاد رکھئے اس بھونڈے شہر میں ایک عام وردی ہے۔ ملّا۔ حافظ۔ بساطی۔ نیچہ بند، دھوبی، سقہ بھٹیارا۔ جولاہا۔ کنجڑا۔ منہ پر داڑھی سر پر بال، فقیر نے جس دن داڑھی رکھی اسی دن سر منڈایا۔"

ایک خط میں بارش کا ذکر اور تباہ کاری کا تذکرہ اس طرح کیا ہے۔

"برسات کا نام آگیا تو پہلے مجملاً سنو ـــــ ایک غدر کالوں کا ایک ہنگامہ گوروں

کا۔ ایک فتنہ انہدام مکانات کا ایک آفت وبا کی۔ ایک مصیبت کال کی۔ اب یہ برسات جمیع حالات کی جامع ہے۔

آج اکیسواں دن ہے۔ آفتاب اس طرح نظر آجاتا ہے۔ جس طرح بجلی چمک جاتی ہے۔ رات کو کبھی کبھی اگر تارے دکھائی دیتے ہیں تو لوگ ان کو جگنو سمجھ لیتے ہیں۔ مبالغہ نہ سمجھنا۔ ہزارہا مکان گر گئے۔ سینکڑوں آدمی جا بجا دب کر مر گئے۔ گلی گلی ندی بہہ رہی ہے۔ قصہ مختصر وہ ان کال تھا۔ کہ مینہ نہ برسا اناج نہ پیدا ہوا ——— یہ پن کال ہے۔ پانی ایسا برسا کہ بوئے ہوئے دانے بہہ گئے۔"

ایک دفعہ دہلی میں بخار کی وبا پھیل گئی ——— جس کا تذکرہ ایک خط میں انہوں نے یوں کیا ہے۔

"پانچ لشکر کا حملہ پے درپے اس شہر پر ہوا۔ پہلا باغیوں کا لشکر اس میں اہل شہر کا اعتبار لٹا دوسرا لشکر خاکیوں کا اس میں جان و مال و ناموس و مکان و مکین و آسمان و زمین آثار ہستی سراسر لٹ گئے۔ تیسرا لشکر کال کا۔ اس میں ہزارہا آدمی بھوکے مرے۔ چوتھا لشکر تپ کا، اس میں تاب و طاقت عموماً لٹ گئی۔ مرے آدمی کم لیکن جب جس کو تپ آئی۔ اس نے اعضا میں طاقت نہ پائی اب تک ایک لشکر نے شہر سے کوچ نہیں کیا۔"

ایک خط میں نہایت لطیف اور پر مذاق انداز میں تعلقات خانہ داری کا اظہار اس طرح کیا ہے۔

"ہر چند قاعدہ عالم یہ ہے۔ کہ عالم آب و گل کے مجرم عالم ارواح میں سزا پاتے ہیں۔ لیکن یوں بھی ہوا ہے۔ کہ عالم ارواح کے گنہگار کو دنیا میں بھیج کر سزا دیتے ہیں۔ چنانچہ میں آٹھویں رجب ۱۲۱۲ھ میں روبکاری کے واسطے یہاں بھیجا گیا۔ تیرہ برس حوالات میں رہا۔ ساتویں رجب ۱۲۲۵ھ کو میرے واسطے حکم دوام حبس صادر ہوا۔ ایک بیڑی میرے پاؤں میں ڈال دی اور دلی شہر کو زندان مقرر کیا۔ اور مجھے اس زندان میں ڈال دیا۔ فکر نظم و نثر کو مشقت ٹھہرایا۔ برسوں کے بعد میں جیلخانے سے بھاگا۔ تین برس بلاد شرقیہ میں پھرتا رہا پایان کار

مجھے کلکتہ سے پکڑ لائے اور پھر اسی مجلس میں سمجھا دیا۔ جب دیکھا یہ قیدی گریز پا ہے۔ دو ہتھکڑیاں اور بڑھا دیں۔ پاؤں بیڑی سے فگار۔ ہاتھ ہتھکڑیوں سے زخم دار مشقت مقرری، اور مشکل ہوگئی۔"

طاقت یک قلم زائل ہوگئی —— بے حیا ہوں —— سال گذشتہ بیڑی کو زاویۂ زندان میں چھوڑ مع دونوں ہتھکڑیوں کے بھاگا۔ میرٹھ مراد آباد ہوتا ہوا رام پور پہنچا —— کچھ کم دو مہینے وہاں رہا تھا کہ پھر پکڑ آیا —— اب عہد کیا پھر نہ بھاگوں گا۔

بھاگوں کیا —— بھاگنے کی طاقت بھی نہ رہی —— حکم رہائی دیکھئے کہ کب صادر ہو ——؟

ایک ضعیف سا احتمال ہے۔ کہ اس ماہ ذی الحجہ میں چھوٹ جاؤں۔ بہر تقدیر بعد رہائی کے تو آدمی سوائے اپنے گھر کے اور کہیں نہیں جاتا۔ میں بعد نجات سیدھا عالم ارواح کو چلا جاؤں گا۔"

مرزا رنج و غم اور اظہار تعزیت کے موقع پر بھی اپنے مخصوص ظریفانہ انداز سے گریز نہیں کرتے —— مرزا حاتم علی مہر کی محبوبہ کی ذمات پر اس طرح سے تعزیت کی ہے۔

"سنو صاحب —— شعرا میں فردوسی اور فقراء میں حسن بصری اور عشاق میں مجنوں —— یہ تین فن میں سر دفتر اور پیشوا ہیں شاعر کا کمال یہ ہے۔ کہ فردوسی ہو جائے —— فقیر کی انتہا یہ ہے کہ حسن بصری سے ٹکر کھائے۔

عاشق کی نمود یہ ہے کہ مجنوں کی ہم طرحی نصیب ہو۔ یلئے اس کے سامنے مری تھی۔ تمہاری محبوبہ تمہارے سامنے مری۔ بلکہ تم اس سے بڑھ کر ہوتے کہ یلئے اپنے گھر میں اور تمہاری معشوقہ تمہارے گھر میں مری —— بھئی مغل بچے بھی غضب ہوتے ہیں جس پر مرتے ہیں اس کو مار رکھتے ہیں۔ میں بھی مغل بچہ ہوں عمر بھر ایک بڑی ستم پیشہ ڈومنی کو میں نے بھی مار رکھا ہے۔ خدا ان دونوں کو بخشے اور ہم تم

دونوں کو بھی ——— ۔

رقعات غالب کو لکھے ہوئے ایک صدی بلکہ اس سے بھی زائد عرصہ گزر چکا ہے۔ مگر غالب نے ان خطوط کو اپنے اعجاز فکر، قدرت بیان اور شوخی طبع سے اس قدر جیتا جاگتا بنا دیا ہے۔ کہ آج بھی پڑھنے والا جب اُن پر نظر ڈالتا ہے۔ تو کسی قسم کی اکتاہٹ محسوس نہیں کرتا۔ بلکہ ذہن میں ایک ایسی خوشگوار فضا پیدا ہو جاتی ہے۔ جو ناول اور ڈرامہ کی جان ہے۔ مجھے تو یقین ہے۔ کہ وقت کے ساتھ ساتھ جس قدر اردو ادب میں فکر و نظر کی بلندی پیدا ہوگی۔ تجربے اور معلومات میں اضافہ ہوگا۔ اسی قدر غالب ہم سے اور قریب آتا جائے گا۔ اور یہی کسی شاعر یا ادیب کی معراج ہے۔

اِنسان ہونا[1]

غالب " آدمی اور انسان " میں بے حد نمایاں اور واضح فرق روا رکھتا ہے اس کے نزدیک ایک آدمی مشکل ہی سے انسان بن سکتا ہے۔ اس میں شک بھی نہیں کہ آدمی اس کائنات کے مرقع کی سب سے حسین اور دل آویز تصویر ہے۔ جس کی تشکیل خالق حقیقی نے ایک دھڑکتے ہوئے دل، روشن دماغ، عزم و عمل اور اظہار و بیان کی خصوصیات کے ساتھ کی ہے۔ اور یہی وہ صلاحیتیں ہیں جو ایک آدمی کو حیوان سے بلند و بدتر کر دیتی ہیں۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے۔ کہ بنیادی فطرت اور مخصوص صلاحیتوں کے اعتبار سے ہر آدمی ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔ اس لئے بہت سے آدمیوں میں آگے بڑھنے اور انسانیت کی منزل تک پہنچ جانے کی صلاحیت مفقود ہوتی ہے۔ یا ہوتی ہے۔ تو بہت کم ــــ بعض میں اگر ہوتی ہے۔ تو انہیں بر وقت اپنی اعلیٰ خصوصیات اور اپنی ذات کا وقوف نہیں ہو پاتا۔ جس سے وہ اپنے ارادوں اور کوششوں کو مناسب اور موزوں وقت پر بروئے کار نہیں لا سکتے۔ کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کو اپنی اعلیٰ صلاحیتوں کا علم تو ہو جاتا ہے۔ مگر ان کو وہ مواقع اور حالات دستیاب نہیں ہو پاتے۔ جو ان کے دل و دماغ کی صحیح خطوط پر رہنمائی کر سکیں اور نہ وہ عزم اور حوصلہ پیدا ہوتا ہے جو انہیں آدمیت کے مقام سے انسانیت

---

[1] قومی زبان ، کراچی - جولائی ۱۹۶۹ء

کی منزل تک پہنچا سکے۔ ایسے بہت ہی کم آدمی ہوتے ہیں۔ جنہیں اپنی بنیادی فطرت کی اعلیٰ خصوصیات اور مخصوص صلاحیتوں کا بروقت علم بھی ہو جاتا ہے اور ان کو اجاگر کرنے اور بروئے کار لانے کے مواقع میسر ہیں چنانچہ جب یہ مواقع میسر آجاتے ہیں تو آدمی میں تلاشِ پیہم اور سعی مسلسل کا جذبہ پوری قوت سے ابھرتا ہے۔ جو اسے زندگی کے طوفانوں کا پامردی سے مقابلہ کرنے اور انقلابوں سے برد آزما رہنے کا نہ صرف سبق سکھا دیتا ہے۔ بلکہ اس کی زندگی گہرے مشاہدے۔ وسیع تجربے اور لامحدود وجدانی کیفیت کے آغوش میں اپنی بقاء کے لئے مسلسل رواں دواں ہو جاتی ہے۔ آخر کار اسی سفر میں ایک وقت وہ مقام بھی آجاتا ہے۔ جہاں نہ صرف آدمی کے اعمال و کردار میں ــــ نظم و ضبط فکر و نظر میں وسعت اور جذبہ و تخیل میں ہم رنگی اور ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے۔ بلکہ خود سے، کائنات سے۔ کائنات کے خالق سے اور اپنے ہم جنس سے پیار کرنا بھی آجاتا ہے۔ جس کی بدولت اسے معرفت ذات اور حقیقت کا گیان حاصل ہوتا ہے۔ میرے نزدیک اسی گیان کا دوسرا نام انسانیت ہے۔ اور جس میں یہ انسانیت پیدا ہو جائے۔ وہ انسان ہے۔

انسان کی تخلیق ہی کو خدا نے اس کائنات کی تشکیل کا سبب بیان کیا ہے اور اسے کچھ ذمہ داریاں اس کائنات کو سنوارنے اور نکھارنے کی اور کچھ پابندیاں کلمۂ حق کے اظہار و بیان کی سونپ کر اس جہان رنگ و بو میں اپنا نائب بنا کر بھیجا ہے۔ نائب خدا کے لئے اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لئے یہ بھی ضروری تھا۔ کہ اس میں وہ اعلیٰ صفات پیدا کی جائیں جن کے سہارے وہ حصولِ انسانیت کے لئے پوری استقامت سے جہد آزما ہو سکے۔

چنانچہ جب خالق حقیقی نے آدم کی تعمیر کی تو اس میں بیشتر اپنی صفات اور کچھ عمل و اختیار کی صلاحیتیں شامل کر دیں۔ تاکہ وہ اس کائنات کی شائستگی دل پذیر انداز سے کر سکے۔ اور فروغ آدمیت کے فرائض بھی بطریق احسن انجام دے سکے۔ اس لئے کائنات کو سمجھنے اور کائنات کے خالق کو جاننے کے لئے یہ ضروری ہے۔ کہ انسان اور اس کی زندگی کی محدود اور لامحدود وسعتوں سے آگہی حاصل کی جائے۔

تاریخ شاہد ہے کہ بشر کو جو صفات اور قوتیں ودیعت کی گئی ہیں جب بھی ان کی تربیت درست اور صحیح طریق پر نہیں ہوئی۔ ان میں نہ صرف جدوجہد ہمت اور حوصلے کا فقدان پیدا ہو گیا ہے۔ بلکہ اس میں وہ حیوانی اور شیطانی خواہشات وعادات بھی ابھر آئی ہیں جن سے آدمیت اور حیوانیت میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔

ایک آدمی ان حالات میں نہ واقفیت ذات ہی حاصل کر پاتا ہے۔ اور نہ عرفان ذات اور اس طرح اس کی تخلیق کا اصل مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے۔ جس کو خالق حقیقی کبھی پسند نہیں کرتا اور جب بھی انسانیت میں گراوٹ اور بے راہ روی کا شدید رجحان پیدا ہو گیا ہے۔ اس نے کسی پیغمبرؑ مرد خدا۔ فلسفی فن کار اور سائنس دان کو پیدا کر دیا ہے۔ جس نے اپنی روحانیت فلسفہ، حکمت سیاست، انکشاف وایجادات اور شعروادب سے دکھی انسانیت کو دوبارہ صحیح راہوں پر لا کھڑا کرنے کی سعی کی ہے۔ اور جیسے جیسے انسانیت کی تربیت درست خطوط پر ہوتی گئی۔ اسی قدر مزاج کائنات بھی متوازن اور تازہ شاداب ہوتا چلا گیا ہے۔

جیسا کہ اوپر تحریر کیا جا چکا ہے۔ معاشرے کی خرابیوں مکروہات اور بدعادات کی آلودگیوں سے نجات دلانے اور ان خوبیوں کے رازہائے سربستہ سے روشناس کرانے کے لئے جو انسان کے خالق نے اس میں مضمر کر دیئے ہیں وقتاً فوقتاً اس کائنات ارضی پر پیغمبر مصلح فلسفی، سائنس دان اور فن کار آتے رہے ہیں مگر ان کے انفاقی فکر وعمل پر اثر ڈالنے اور مضمرات کے بارے میں مکمل دقوف وآگہی بخشنے کا طریقہ ہمیشہ جدا جدا بھی رہا ہے۔ اور کم وبیش بھی —— بالکل اسی طرح کہ پیغمبر کا دائرہ وسیع ہوتا ہے۔ اور اس دائرے، کے علاوہ بھی کئی چھوٹے اور چھوٹوں سے نسبتاً کچھ بڑے دائرے بنتے ہیں جو مرد خدا۔ فلسفی فن کار اور سائنس دان کے ہوتے ہیں۔

اب تقریباً نصف صدی سے سائنس نے بھی اس قدر ترقی کرا ہے۔ کہ وہ نہ صرف کائنات ارضی بلکہ تسخیر خلا اور چاند تک رسائی کی جدوجہد میں اسی لئے مصروف ہے۔ کہ ابن آدم کو نئی رفعتوں سے ہم کنار کرایا جا سکے۔ اور اس میں شک

بھی نہیں کہ سائنس کی ہر نئی ایجاد اور نئے انکشاف نے انسان کو چونکا بھی دیا ہے۔ اور اس کے فہم و ادراک میں کافی اضافہ بھی کیا ہے۔ لیکن یہ سوالات اب بھی ذہن انسانی میں ابھرتے رہتے ہیں کہ کیا اس قدر سائینسی ترقی کے باوجود انسانیت اپنے اعلیٰ مدارج پر پہنچ گئی ہے۔ اور کیا ان سائینسی انکشافات اور ایجادات کی اعانت سے ایک ایسے صالح اور پرسکون معاشرے کی تشکیل ہوسکی ہے۔ جس میں انسان امن و آشتی کے ساتھ اپنی زندگی گزار سکے۔ یا اب نہ سہی تو آئندہ اصلاح احوال کی کوئی ایسی نشاندہی کی گئی ہو۔ جس سے مستقبل قریب میں کوئی امید باندھی جاسکے۔ مگر میرے پاس تو ان سوالات کا جواب نفی کے سوا کچھ نہیں۔ اور اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ میں تو اب بھی انسانی زندگی میں بے اطمینانی، بے چینی اور خلفشار پاتا ہوں جس کا بڑا سبب مادیت پرستی اور ہوس زر ہے۔ جو میرے نزدیک سائنس کی دین ہیں جس سے معاشرے میں ان گنت مسائل پیدا ہو گئے ہیں۔ اور اکثر معاملات سلجھنے کے بجائے ایسے الجھ گئے ہیں کہ ان کے آئندہ سلجھنے کی بھی کوئی توقع نظر نہیں آتی۔ معاشرے کے ان مایوس کن حالات کو میری رائے میں ایک دیدۂ بینا ہی اپنے عمل پیہم سے راہ راست پر لاسکتا ہے۔ جس کی نظر حالات کے رخ پر بھی ہوتی ہے۔ اور انسانیت کے تقاضوں پر بھی ——!

پیغمبر اور مرد خدا انسانیت کی تربیت سادہ مگر واضح انداز بیان سے کرتا ہے اس کے ہاں استدلال کی بھول بھلیاں اور جذبہ و خیال کی رنگینیاں نہیں ہوتیں بلکہ براہ راست اصلیت اور حقیقت کا اظہار ہوتا ہے۔ وہ اپنی بات آدمی کے دل اور روح سے کرتا ہے۔ اور تھوڑے ہی عرصہ میں وجد و محویت کے ذریعے اسے نہ صرف کائنات ارض و سما کی سیر کرا دیتا ہے۔ بلکہ نظام عالم کے اسرار و رموز سے بھی واقف کرا دیتا ہے۔ جس سے انسان کا دل و دماغ اس قدر روشن اور تابناک ہو جاتا ہے کہ وہ اس روشنی کے ذریعہ اپنی حقیقت سے بھی آشنا ہو جاتا ہے۔ اپنے خالق سے بھی اور اپنے فرائض سے بھی ——— اس میں ظاہری اور باطنی علوم کا دریا موجزن ہو جاتا ہے۔ اور وہ جذبہ و شوق ابھرتا ہے۔ جو اس کے فرائض کی تکمیل پورے تیقن سے کرا سکے۔ اسی جذبہ شوق کے سفر میں آخر کار ایک مقام وہ بھی آجاتا ہے۔ جہاں ایک

آدمی اہل دل بھی ہو جاتا ہے اور صاحب حال بھی۔ پیغمبر کی ذات اخلاق و فضائل علم و فضل اور رشد و ہدایت کا پُر نور مینار ہوتی ہے۔ جس کی روشنی اس کائنات میں چاروں طرف پھیل جاتی ہے۔ جس سے ہر گم گشتہ راہ اپنی فکر و نظر کے مطابق روشنی بھی حاصل کرتا ہے۔ اور گرمی بھی۔

اس طرح ایک پیغمبر یا مرد خدا انسان کی باطنی دنیا پر قبضہ جما کر اپنی روحانیت سے انسانیت کے بگڑے ہوئے مزاج کو انتہائی خوبصورتی سے بڑی حد تک بدل دیتا ہے۔ جس سے ایک ایسا معاشرہ معرض وجود میں آتا ہے۔ جس میں انسان کلمۂ حق بھی بلند کر سکتا ہے۔ اور اپنے فکر و عمل اور جذبہ و تخیل سے امن و آشتی کی زندگی بھی گزار سکتا ہے۔

فلسفی کی اپیل انسان کے ذہن سے ہوتی ہے۔ وہ حقیقت کی تلاش اسباب و عوامل کی روشنی میں کرتا ہے۔ اور اس کی تفہیم و تعبیر استدلال کے ذریعہ جس سے انسان متاثر کم اور متحیر زیادہ ہوتا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔ کہ ہر انسان کی ذہنی سطح یکساں نہیں ہوتی۔ اس لئے ہر انسان کا ذہن فلسفی کے طریقۂ اظہار تک رسائی آسانی سے حاصل نہیں کر پاتا۔ اس کے ہاں زبان و بیان اور فکر و خیال میں سادگی نہیں ہوتی اور وہ سیدھی سادھی بات بھی گھما پھرا کر کہتا ہے جس سے اس کی بات کچھ سمجھ میں آتی ہے۔ اور کچھ الجھ کر رہ جاتی ہے۔ فلسفی اپنے اظہار بیان کے لئے الفاظ کو وسیع معنی دینے کے لئے اصطلاحات بھی مرتب کرتا ہے جن کا سمجھنا اور معاشرے کے مزاج میں ان کا رچ بس جانا آسان نہیں ہوتا جس کے لئے وقت کی ضرورت بھی ہوتی ہے۔ اور ذہنی رسائی بھی۔ جن کا میسر آجانا بھی آسان نہیں ہوتا۔ اور بہت کم لوگ فلسفی کے طریقۂ اظہار سے حقیقت تک پہنچ پاتے ہیں

فنکار انسانیت کی اصلاح اپنے جذبہ و فکر کی معجز نمائیوں سے کرتا ہے۔ وہ بے حد ذہین اور حساس ہوتا ہے۔ وہ اپنے معاشرے کی تصویر ایسے صاف اور واضح انداز میں کھینچ دیتا ہے۔ کہ اس عہد کی انسانیت کے خدوخال اس میں پوری طرح جلوہ گر ہو جاتے ہیں۔ وہ اپنا واسطہ انسان کے دل سے بھی رکھتا ہے۔ اور دماغ سے بھی اور اپنی عقل و وجدان کی باہم آمیزش اور آویزش سے ایسا جہان فکر و نظر تعمیر کرتا ہے

جس میں فکر فردا بھی ہوتی ہے۔ غم دوش بھی۔ عہد حاضر کے تقاضے بھی اور آگے بڑھنے کی تڑپ اور حوصلہ بھی ——— وہ جب چاہتا ہے اپنے "دیدہ بینا" اور تخیل کی معجز نمائی سے حسن ازل اور اس کے لامحدود جلوؤں کی بوالعجبی سے بھی انسان کو روشناس کرا دیتا ہے۔ اور حقیقت کائنات سے بھی۔

وہ مسائل حیات جنہیں فلسفی دلائل و براہین کے ذریعہ عقل انسانی کو سمجھانے میں کافی وقت لے لیتے رہیں۔ انہیں ایک فن کار اپنے جذبہ و تخیل کی مدد سے بہت جلد حل کر دیتا ہے۔ فن کار حقیقت کا اظہار کہیں مختلف رنگوں کی دلآویز آمیزش سے کرتا ہے۔ کہیں تیشہ و تبر کی متوازن اور دلکش تراش خراش سے کہیں آواز کے زیر و بم، لوچ لچک اور جذب و مستی سے اور کہیں الفاظ و معنی اور زبان و بیان کے پر اثر طلسم سے ـ؛

شاعر یا ادیب بھی ایک فن کار ہے۔ جو حقیقت کا اظہار الفاظ و معنی کے جلوۂ صد رنگ سے کرتا ہے۔ جس میں منطقی ترتیب کم ہوتی ہے۔ اور آپ بیتی کی تفسیر زیادہ ندرت بیان، بلندی خیال اور الفاظ و معانی کی خوشرنگ جلوہ گری اور ان کے اثر ہی سے شعر و ادب کی تخلیق ہوتی ہے۔ اور اسی تخلیق میں تہذیب و تمدن کی سدرتا بھی ہوتی ہے۔ روح عصر کے گہرے نقوش بھی اور آئندہ کی توقعات بھی جس سے انسان کی رہنمائی بھی ہوتی ہے۔ اور انسان کو فروغ بھی حاصل ہو جاتا ہے۔ ایک شاعر یا ادیب کو اپنے معاشرے کی زندگی اور حالات کا پورا احساس ہوتا ہے۔ اور اس کی نظر حسن فطرت پر گہری پڑتی ہے۔ جس کا اظہار وہ اپنے مخصوص اور پر اثر انداز میں کر دیتا ہے۔ اور جب اپنی جد و جہد مسلسل سے فن کے اعلےٰ مدارج پر پہنچ جاتا ہے تو وہ محبوب دل انسانی بھی ہو جاتا ہے۔ اور محبوب فطرت بھی اور اس طرح خود کو وہ زمرت زندہ جاوید بنا لیتا ہے۔ بلکہ انسانی زندگی کا رہنمائی کا سرچشمہ بھی بن جاتا ہے۔

ہر انسان کو انفرادی طور پر خالق حقیقی کچھ ایسی خصوصیات اور خوبیاں بھی عطا کرتا ہے جو ایک دوسرے انسان سے اکثر مختلف بھی ہوتی ہیں اور کم و بیش بھی لیکن ان صفات میں اس وقت تک آب و تاب اور چمک دمک پیدا نہیں ہوتی جب تک ان کی تربیت صحیح خطوط پر نہ ہو۔ انسان کی تربیت ہوش سنبھالنے کے بعد ہی سے

شروع ہو جاتی ہے۔ اور زندگی بھر ہوتی رہتی ہے۔ بچپن میں گھر کے ماحول سے لڑکپن میں تعلیم اور اسکول کے ماحول سے ـــــ پھر معاشرے کے حالات اور رجحانات سے اور اپنے مشاہدات تجربات اور احساسات سے ـــــ ایک شاعر اور ادیب میں ویسے بھی احساس، جستجو اور عمل کا جذبہ دوسروں سے زیادہ ہی ہوتا ہے اور جب تربیت بھی درست ہو تو پھر اس کی شخصیت کچھ سے بہت کچھ بن جاتی ہے۔

غالب ایک شاعر بھی ہیں اور ادیب بھی جن کو خالق حقیقی نے طبع سلیم بھی عطا کی تھی۔ اور ذہن رسا بھی شگفتگی اور خوش مذاقی بھی۔ محبت اور ہمدردی بھی۔ عزم اور حوصلہ بھی اور وہ مواقع بھی جن سے ان کی شخصیت کی تعمیر ہوتی چلی گئی۔ مگر یہاں اس امر کا جائزہ لینے کے لئے کہ ان کا تصور انسان کے متعلق کیا ہے اور وہ انسانیت کی اپنے شعر و ادب سے کس قدر خدمت کر سکے ہیں ان حالات و عوامل پر سرسری نظر ڈالنا ہوگی۔ جن سے غالب کی طبیعت اور مزاج نے تربیت حاصل کی اور اس تربیت نے ان میں انسانیت کے متعلق اپنے عہد سے علیحدہ ایک نئی سوچ اور واضح شعور ابھارا۔

غالب ۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ء کو آگرے کے ایک کھاتے پیتے گھرانے اور نسلی اعتبار سے اعلےٰ خاندان میں پیدا ہوئے۔ بچپن بڑی بے فکری اور رنگ رلیوں میں ہنسی خوشی گزرا غالب کے باپ اور چچا کا انتقال ان کی کم سنی میں ہی ہو گیا تھا۔ اس کے باوجود غالب کی تعلیم کی طرف سے غفلت نہیں برتی گئی۔ انہوں نے باقاعدہ کسی مکتب میں تعلیم نہیں پائی۔ لیکن ابتدائی تعلیم میر معظم اور نظیر اکبر آبادی سے حاصل کی اس کے بعد ہرمزد سے۔

ہرمزد نامی پارسی سیر و سیاحت کرتا ہوا ۱۸۱۰ء میں آگرے آنکلا تھا اور یہاں آکر مسلمان ہو گیا۔ اور اپنا نام عبدالصمد رکھ لیا۔ عبدالصمد فارسی کا بڑا عالم تھا غالب اس کے ساتھ تقریباً دو سال رہے اور اس سے بہت کچھ حاصل کیا۔ غالب کو ویسے بھی فارسی شعر و ادب سے فطری لگاؤ تھا اس کے علاوہ غالب کے خطوط سے پتہ چلتا ہے۔ کہ فلسفے، منطق، ہیئت، نجوم، عربی اور طب کے بارے میں بھی ان کو خاصی معلومات تھی۔

دلّی میں غالب کی آمد کا سلسلہ سات آٹھ سال کی عمر سے شروع ہو گیا تھا لیکن ۱۸۱۳ء میں مستقلاً دلی آ گئے۔ دلّی پر ۱۸۰۳ء میں انگریزوں کا قبضہ ہو گیا تھا۔ اور اس قبضے سے قبل وہاں کی زندگی میں جو اضمحلال افسردگی اور بے چینی تھی۔ وہ بڑی حد تک ختم ہو چکی تھی۔ لوگ سکون و اطمینان کے ساتھ کاروبار حیات میں مصروف ہو گئے تھے۔ جس سے دلّی کی زندگی کے ہر گوشے میں نہ صرف استقامت پیدا ہو گئی تھی۔ بلکہ ترقی بھی شروع ہو گئی تھی۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دلّی میں یک وقت کئی صاحب کمال جمع ہو گئے۔

شعرا میں شاہ نصیر، ذوق۔ مومن اور ظفر علماء میں شاہ عبدالقادر، شاہ عبدالعزیز۔ شاہ اسمٰعیل شہید، سید احمد بریلوی۔ مولوی فضل حق خیرآبادی اور مولوی صدر الدین آزردہ۔

اطباء میں حکیم احسن اللہ خان اور حکیم محمود خان اور نقادوں میں نواب مصطفیٰ خان شیفتہ تھے۔ جن کی موجودگی سے اس وقت کی دِلّی دبستان علم و ادب بن گئی تھی۔ غالب اسی دِلّی میں تربیت پذیر ہوئے۔ دلّی میں غالب کو شعر و ادب کا ماحول بھی ملا اور مذہبی تحریکات سے بھی واسطہ پڑا۔ دلّی کے تمام اہل الرائے اس وقت مذہبی اعتقادات میں مقلدین اور غیر مقلدین کے دو گروہوں میں تقسیم ہو گئے تھے غالب بھی ان تحریکات سے خود کو علیحدہ نہ رکھ سکے اور انہوں نے ایک مثنوی مولوی فضل حق خیرآبادی کے اصرار پر کہی۔ مگر ذہنی طور پر وہ شاہ اسمٰعیل شہید کے عقائد و نظریات سے متاثر نظر آتے ہیں کیونکہ غالب فطرتاً تقلید سے گریز کرتے تھے۔ ان تحریکات سے غالب کس حد تک متاثر ہوئے۔ اس سے قطع نظر غالب کو دلّی میں وہ علمی اور ادبی فضا ضرور مل گئی جو آگرے میں موجود نہ تھی۔

غالب جب ترک سکونت کر کے دلّی آئے، ان کی شادی ہو چکی تھی۔ جس کی وجہ سے ان پر گھریلو زندگی کے تقاضوں اور ذمہ داریوں کا بوجھ پڑنا شروع ہو گیا تھا۔ غالب کی بیوی بھی ایک نواب گھرانے کی بیٹی تھیں اس لئے ان کے احساسات اور مطالبات بھی یقیناً غالب کی طرح جاگیردارانہ مزاج کے مطابق ہی ہوں گے۔ ادھر غالب کی زندگی بچپن میں بڑی فارغ البالی اور اطمینان کے ساتھ گزری تھی۔ اس لئے وہ اب بھی

اسی قسم کی زندگی کے خواہش مند تھے لیکن انہیں زندگی کے اس عہد میں وہ سہولتیں اور آسانیاں میسر نہ آسکیں جو بچپن کے خوشگوار دور میں ہاتھ باندھے کھڑی نظر آتی تھیں۔ جس سے غالب کی زندگی بڑی پریشان ہوگئی۔ اور یہ پریشانیاں اسی قدر بڑھتی گئیں جس قدر ذرائع آمدنی مسدود ہوتے گئے۔

غالب نے ان معاشی پریشانیوں کو ختم کرنے کیلئے کئی سفر بھی کیے۔ جن سے غالب کی معلومات اور مشاہدے میں بڑا اضافہ ہوا لیکن زندگی کو وہ سکون واطمینان پھر بھی حاصل نہ ہوسکا جس کے غالب آرزومند تھے اور ہم دیکھتے ہیں کہ ان کی تمام زندگی مسلسل محرومیوں اور نامرادیوں کا شکار رہی لیکن ان کی طبع سلیم شوخی اور شگفتگی نے ان ناکامیوں اور نارسائیوں کے باوجود انہیں زندگی سے کسی لحظہ مایوس و بیزار نہیں ہونے دیا۔ بلکہ وہ عزم اور حوصلہ ابھرا جس نے نہ صرف غموں پر مسکرانا سکھا دیا۔ بلکہ روح میں وہ گداز اور احساس میں وہ شدت پیدا کردی جس نے انہیں انسان اور انسانیت کے رموز سے بڑی حد تک آشنا کردیا۔

غالب کی شاعری کی ابتداء دلّی آنے سے قبل تقریباً گیارہ سال کی عمر میں ہوچکی تھی۔ اس وقت اردو شاعری پر فارسی شاعری کا گہرا اثر تھا۔ جو غالب کو پسند نہیں تھا۔ اصناف شاعری میں غزل ہر دور میں سب سے زیادہ مقبول رہی ہے۔ اور آج بھی قصیدہ، مرثیہ اور مثنوی تقریباً ختم ہوگئے ہیں مگر غزل اپنے نئے مزاج اور نئی اقدار کے ساتھ نہ صرف زندہ ہے۔ بلکہ ترقی پذیر ہے۔ اور اس کی بڑی وجہ یہ ہے۔ کہ یہ واردات حسن و عشق اور محسوسات قلبی کے اظہار کا سب سے زیادہ موثر اور مستحسن ذریعہ ہے۔ عشق کا جذبہ انسان کی سرشت میں اس کی ابتداء سے موجود ہے اور جب تک انسانیت باقی ہے یہ بھی قائم اور برقرار رہے گا۔ عشق کے ساتھ غزل میں عشق حقیقی اور مجازی دونوں کا تذکرہ کیا جاتا رہا ہے۔ اس لئے غزل میں تصوف کا عنصر بھی غالب رہا ہے۔

غالب کے دور میں تصوف کے ساتھ "وحدۃ الوجود" کا تصور کچھ مخصوص نظریات اور معتقدات کے ساتھ غزل میں داخل تھا۔ جس نے انسان کی فکر وعمل میں پاشکستگی کا احساس اور سہل انگاری کا پیدا کردی تھی۔ اور انسان عمل وحرکت سے

زیادہ تقدیر پر بھروسہ کرنے کا عادی ہو گیا تھا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ معاشرہ میں منفی تطریات پیدا ہو گئے۔

منفی نظریہ حیات کی کارفرمائی ہمیں کئی مذاہب کی تعلیمات میں بھی ملتی ہے۔ اور یہ افلاطون کے اس فلسفۂ حیات کی آواز بازگشت ہے۔ جس کا درس اس نے تقریباً ساڑھے تین سو سال قبل مسیح انسانیت کو دیا تھا اس کا نظریۂ حیات یہ تھا کہ یہ عالم موجودات جس میں ہم رہتے ہیں کوئی حقیقت نہیں رکھتا اس کی حیثیت نقش برآب سے زیادہ نہیں اس لئے اسے عالم گیر صداقت (Universal Truth) کی طرح تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ اس فلسفے کا اثر مختلف اقوام، مذاہب اور ادبیاتِ عالیہ پر پڑا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انسانی زندگی میں ذوقِ عمل اور جہدِ مسلسل سے گریز اور کاروبار حیات سے نفرت و بددلی کا جذبہ پیدا ہو گیا۔

کلیسا کی عقائد کے مطابق بھی ہر شخص گناہ گار ہے۔ اور حضرت عیسےٰ نے صلیب پر چڑھ کر ساری انسانیت کے گناہوں کا کفارہ ادا کیا ہے۔ رہبانیت کی ترغیب ان کے ہاں موجود ہے۔ مگر اسلام نے اس منفی نظریۂ حیات سے واضح طور پر انکار کیا۔ اور وہ راہبانہ زندگی بھی قطعاً پسند نہیں کرتا۔

اسلام کے نزدیک انسانیت کی معراج یہ ہے۔ کہ ایک انسان احکام الٰہی کی روشنی میں زندگی کے نشیب و فراز اور کشمکش حیات سے پامردی اور عزم و حوصلے کے ساتھ نہ صرف نبرد آزما رہے بلکہ حقیقت کے چہرے سے پردے بھی اٹھاتا رہے۔ اور ان اصنام خیالی پر جو زندگی سے فرار اور عمل سے گریز کا سبق دیتے ہیں بلا خوف پرے ڈالتا بھی رہے۔

یہی نہیں ——— بلکہ ایسا معاشرہ بھی تشکیل دینے کی سعی کرے جس میں خود بھی ترقی کر سکے۔ اور بنی نوع انسان کی بقا اور سلامتی کی راہیں بھی صحیح سمت کی طرف موڑی جا سکیں مگر جب اسلام سرزمین عرب سے نکل کر مختلف سمتوں میں پھیلنا شروع ہوا۔ تو وہ اپنی اصل روح قائم نہ رکھ سکا۔ اس میں دیگر ممالک کے جغرافیائی معاشرتی اور تاریخی اثرات اور غیر اسلامی اعتقادات آہستہ آہستہ شامل ہونا شروع ہو گئے جس کے سبب اسلام کے بنیادی عقائد میں بڑی شکست و ریخت ہوئی تقریباً

دوسری صدی ہجری میں اسلامی تصوّف کا آغاز ہو گیا تھا اس تصوف میں بعد کے آنے والے چند صوفیہ نے اپنے ایسے افکار و خیالات داخل کردیئے جن کا تعلق شرع اور اصول دین سے کچھ نہیں تھا بلکہ ان کے نظریات افلاطونی خیالات سے قریب تر تھے۔

چنانچہ اس وقت تصوّف کے تحت خالق حقیقی اور وجود بشر کو سمجھنے کیلئے دو نظریات بڑے نمایاں اور روشن نظر آتے ہیں جن میں سے ایک یہ تھا کہ انسان کی زندگی قطعی ناپائیدار وقتی اور فانی ہے اور انسان کا کمال بس یہ ہے کہ وہ اپنی ذات کو عبادت اور ریاضت سے ذات الہیٰ میں فنا کردے اس تصوّر سے انسان کو راہبانہ زندگی کی بھی ترغیب ملتی ہے۔ دوسرا نظریہ یہ تھا کہ ساری کائنات کی تخلیق ذات الہیٰ نے کی ہے۔ گر وہ خالق ہے۔ اور اس کے سوا ساری کائنات مخلوق۔ انسان اس مخلوق کا بلند ترین مظہر ہے۔ جو بذات خود ایک عالم بھی ہے۔ اور خدا اور فطرت کا درمیانی رابطہ بھی۔ وہ اپنی جہد مسلسل ہی سے معرفت ذات بھی حاصل کرسکتا ہے۔ اور عرفانِ الہیٰ بھی ——

چنانچہ یہ دوسرا نظریہ ہی اسلامی تعلیمات کے عین مطابق ہے لیکن جب اسلام ایران پہنچا تو تصوّف کا وہ پہلا نظریہ ہی اہل عجم کی طبعیت اور مزاج کے عین مطابق تھا جس میں حرکت کم اور سکون زیادہ تھا۔ جس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ عجمی عقائد میں افلاطون کے فلسفہ حیات کے زیراثر آغاز اسلام سے قبل ہی نفی ذات کا تخیل موجود تھا۔ چنانچہ تصوّف کا یہی نظریہ جس کو اصطلاحاً "وحدۃ الوجود" کا نام دیا گیا اہل عجم کی زندگی تصوّف اور شعر و ادب میں رچ بس گیا وحدۃ الوجود کے اس غیر اسلامی نظریۂ حیات کے خلاف ایک آواز اہل عجم میں بھی پچیس تیس سال تک بلند ہوتی سنائی دیتی ہے۔ مگر اس کے بعد بھی وہاں کے غیر اسلامی نظریات کے شور شغب میں دب کر رہ گئی — یہ آواز مولانا روم کی تھی۔

ہند کی تہذیب اور تمدن میں بھی قیام اسلام سے قبل بدھ مت اور ویدانیت کے نظریہ حیات کے گہرے نقوش موجود تھے۔ جن میں نفی ذات کا تصوّر سب سے زیادہ اہمیت رکھتا تھا۔ بدھ مت اور ویدانت کی تعلیم ہی یہ تھی۔

کہ انسان کی زندگی شر یا جبر کے سوا کچھ نہیں اور اس شر سے مکتی یا نروان (نجات) اسی وقت حاصل کیا جا سکتا ہے۔ جب اس زندگی کو ترک کرکے راہبانہ طرزِ زندگی اختیار کر لی جائے۔ چنانچہ ہند کے اسلامی تصوّف میں جبر کا جو رجحان ملتا ہے۔ وہ عجمی اور ویدک اثرات کا نتیجہ ہے۔

مغل شہنشاہ اکبر کیونکہ علم دوست اور سخن نواز تھا اس لئے جہاں بہت سے شعراء اور اہلِ علم ایران سے ترک سکونت کرکے اس کے دورِ حکومت میں ہند آ گئے تھے۔ وہاں کئی صوفی اور اہلِ بصیرت بزرگ بھی ہند میں جمع ہو گئے۔ مگر یہاں اس بات کو بھی نظر میں رکھنا چاہیئے کہ ہند میں اہل اللہ اور صوفیہ کی آمد کا سلسلہ چوتھی صدی ہجری میں شروع ہو گیا تھا۔

۱۰۳۹ء میں حضرت داتا گنج بخش لاہور تشریف لا چکے تھے۔ اور ان سے قبل ان کے پیر بھائی شیخ حسین زنجانی وہاں موجود تھے۔ چنانچہ ان شعرا اور بزرگانِ دین کی موجودگی سے یہ نتیجہ نکلا کہ یہاں ہندی عجمی شاعری کو بھی فروغ حاصل ہوا جس میں وحدۃ الوجود کا نظریہ موجود تھا۔ اور اہل اللہ نے بھی اپنے رشد و ہدایت سے اہلِ ہند کے دلوں کو انوارِ الٰہی سے منور کرنا شروع کر دیا۔ مگر اس عہد میں بعض صوفیوں نے وحدۃ الوجود کے نظریئے پر اس قدر زور دیا کہ اسلامی شرعی نظریہ حیات کی نفی ہونا شروع ہو گئی۔ اور اصل اسلامی اقدار کے ختم ہو جانے کا شدید خطرہ پیدا ہو گیا۔ چنانچہ حضرت مجددؒ الف ثانی نے عہدِ جہانگیری میں اپنے جذب و نظر اور فکر و عمل سے تمام اصنامِ خیالی کی بلا خوف و خطر شکست و ریخت شروع کر دی اور اصل مقصدِ اسلام اور شرعی نظامِ حیات کی رہنمائی اپنی تعلیم و تبلیغ کے ذریعے کی جس کا اثر اس وقت کے ماحول پر گہرا ہوا مگر وحدۃ الوجود کا یہ تخیل کچھ عرصہ کے لئے ذہنوں میں دب تو گیا۔ لیکن بالکل ختم نہ ہو سکا بلکہ آہستہ آہستہ پرورش پاتا رہا۔ اور دوبارہ مغلیہ حکومت کے زوال پذیر دور میں ابھرا مگر اس وقت شاہ ولی اللہ اور ان کے رفقاء میدانِ عمل میں کود پڑے اور اپنے جذبۂ ایمانی اور علم و بصیرت سے ایسے پُر نور چراغ روشن کر دیئے کہ اسلام کی اصل روح کا بھی پتا چل گیا۔ اور صراطِ مستقیم کا بھی۔ لیکن یہ کیفیت بھی بہت زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہی۔ اور ان سب کوششوں کے باوجود غالبؔ کے دور تک وحدۃ الوجود کا

نظریہ شعر و شاعری میں بھی موجود تھا اور بہت سے انسانوں کے دلوں میں بھی۔

غالب نے اپنے افکار و عقائد کا جو مرقع اپنے شعر و ادب میں پیش کیا ہے اس کا جائزہ لینے سے غالب نظریہ وحدۃ الوجود کے کچھ قائل بھی نظر آتے ہیں اور کچھ اس سے گریزاں بھی۔ مگر گریزاں زیادہ ہیں اور قائل کم —— اور میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ قائل روایتاً اور گریزاں فطرتاً روایتاً اس لئے کہ غالب کا سیاسی ماحول مایوسیوں اور پریشانیوں کا دور تھا۔

ایک تہذیب سالہا سال کی تابانیوں کے بعد تاریکیوں کی اتھاہ گہرائی میں ڈوب رہی تھی اور دوسری آن بان کے ساتھ ہند میں داخل ہو رہی تھی سالہا سال کی تہذیب جو اہل دہلی کی زندگی اور مزاج کا حصہ بن چکی تھی۔ اس کے مٹنے کا غم لوگوں کے دلوں میں گہرا تھا۔ اور ممکن نہیں کہ یہ غم غالب کی شخصیت کا بھی حصہ نہ بن سکا ہو۔ جب کہ غالب خود مغل بھی تھے۔ اور جاگیردارانہ نظام کے پروردہ بھی۔

یہ ضرور ہے۔ کہ اس سیاسی غم کا اظہار ان کے کلام و بیان میں کھل کر نہیں ملتا۔ دوسرے غالب کی معاشی ناآسودگی بھی اُن کی پریشانیوں میں مسلسل اضافہ کر رہی تھی۔ جب انسان کی زندگی پے در پے ناکامیوں اور غموں کی آماجگاہ بن جاتی ہے۔ تو اس کا دل "گردش مدام" سے گھبرا جاتا ہے۔ وہ تدبیر سے زیادہ تقدیر کا قائل نظر آنے لگتا ہے۔ اور یہ مشاہدہ ہے کہ جب مایوسی حد سے زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ تو ایک انسان بعض وقت غموں سے نجات کا ذریعہ موت کے آغوش ہی کو سمجھ لیتا ہے۔ ؎

کیوں گردشِ مدام سے گھبرا نہ جائے دل
انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں

⁂

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں!
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

⁂

قید و حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

٭

تیسری وجہ یہ بھی کہ وحدۃ الوجود کے نظریہ کی جڑیں معاشرتی، علمی اور ادبی زندگی میں اس قدر گہری پیوست ہو گئی تھیں کہ ان سے ایکا ایکی رشتہ توڑنا اور کوئی ایسی ڈگر اختیار کرنا جو عام روش سے علیحدہ ہو آسان بات نہ تھی۔

غالبؔ طبعاً اور فطرتاً اس تصوف کے قائل نہیں تھے۔ جس سے "جبر" کا احساس سوا ہوتا ہے۔

ان کی زندگی میں حرکت بھی ہے اور عمل بھی۔ وہ زندگی کی مجبوریوں سے دل برداشتہ ہو کر روتے نہیں زیرِ لب مسکراتے ہیں جیسے کہہ رہے ہوں کہ انسان کی زندگی میں تو ایسا ہوا ہی کرتا ہے۔ اور اہلِ دل کے لئے "غمِ عشق" یا "غمِ روزگار" کا ہونا ضروری ہے۔ وہ اپنی شاعری کو بھی غم کا ہی فیضان سمجھتے ہیں۔ اور اپنے غم ہی سے وہ دوسروں کا غم محسوس کرتے ہیں۔

ہر ناکامی کے بعد ان کا ذوقِ ہستی دوبارہ انہیں نئے عزم اور نئے حوصلے کے ساتھ نئی راہ پر لا کھڑا کرتا ہے۔ اور وہ ایسی تیزی سے چلنے لگتے ہیں جیسے پہلے کچھ ہوا ہی نہیں۔ اور یہ سلسلہ زندگی بھر جاری رہتا ہے۔

غالبؔ کا انسان خدا پرست بھی ہے۔ اور انسان دوست بھی وہ حسنِ ازل پر بھی ایمان رکھتا ہے۔ اور رتبہ محمدؐ پر بھی —— وہ مظاہرِ فطرت کے وجود سے بھی واقف ہے۔ اور مقامِ انسانیت سے بھی۔ وہ انسانی مرتبے اور آن بان کا ہر جگہ اور ہر مقام پر خیال رکھنا نہیں بھولتا۔ چاہے اس کا گزر حریمِ ناز میں ہو یا بارگاہِ الٰہی میں وہ جب اپنے خالق سے باتیں کرتا ہے۔ بے جھجک صاف صاف اور کھری کرتا ہے۔ یہ ضرور ہے بے ادب نہیں ہوتا۔ وہ خدا سے اپنے ذلیل و خوار ہونے کا سبب بھی دریافت کر لیتا ہے۔ جب کہ اس کی شان یہ رہی کہ اس کی جناب میں خود اسے "گستاخیٔ فرشتہ" پسند نہ تھی اور وہ زمانے کے مٹانے کی شکایت بھی کر دیتا ہے۔ جبکہ اسے یہ علم ہے۔ کہ وہ اس جہانِ رنگ و بو میں یکتا اور منفرد ہے۔ اور مٹا یا صرف اس کو

جاتا ہے۔ جو مکرّر تحریر ہو گیا ہو وہ اپنے خدا سے اس کا بھی آرزو مند ہے کہ اگر تیرا یہی انصاف ہے کہ مجھے گناہوں کی سزا دی جائے تو ان ناکردہ گناہوں کی بھی سزا ملنا چاہیئے۔ جن کی حسرت میرے دل میں باقی رہ گئی ہے۔ وہ یہ بھی کہہ دیتا ہے۔ کہ ہر مخلوق کو اس کے ظرف اور حوصلے کے اعتبار ہی سے امتحان میں ڈالا جا سکتا ہے۔

اسے خدا سے یہ شکوہ بھی ہے۔ کہ فرشتوں کے لکھے پر ناحق سزا دی جاتی ہے جب کہ انصاف کا تقاضہ یہ ہے۔ کہ شہادت لئے بغیر سزا نہ دی جائے فرشتے جو تیری مخلوق ہیں اور انہیں تیرا قرب بھی حاصل ہے۔ ان کا براہ راست انسان سے کوئی تعلق ہے نہ واسطہ۔

ایک انسان ہی انسان کا ہمدرد بھی ہو سکتا ہے۔ اور اپنے ہم جنسوں کی کوتاہیوں سے واقف بھی۔ جو ثبوت تحریر موجود نہیں ہوتا۔ پھر میرے لئے یہ کس طرح قابل قبول ہو سکتا ہے کہ وہ نوشتۂ اعمال جس پر سزا دے دی جاتی ہے۔ درست ہے ؎

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیٔ فرشتہ ہماری جناب میں

٭

یارب زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لئے
لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں میں

٭

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

٭

گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلی نہ طور پر!
دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

٭

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

٭

غالب کا انسان خالقِ حقیقی کے حسن کو کامل ترین سمجھتا ہے۔ اور اس کی موجودگی میں کسی نامکمل اور ناپائیدار حسن کی دل فریبی اور رعنائی کو ہیچ سمجھتا ہے۔ لیکن وہ خدا سے یہ استفسار کرنے سے بھی نہیں چوکتا کہ جب تیرا حسن لازوال اور کامل موجود تھا۔ تو پھر اس ہنگامہ آرائی کی کیا ضرورت تھی۔ کہ پری چہرہ لوگ "غمزہ و عشوہ" زلف عنبریں" نگہہ چشم سرمہ سا" سبزہ و گل" ابر" اور" ہوا" کو تخلیق کر دیا۔ کیا یہ سب کچھ مجھے پریشان کرنے اور میرا امتحان لینے کے لئے نہیں کیا گیا ہے ؎

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے
یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں!
غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے
شکنِ زلفِ عنبریں کیوں ہے
نگہہ چشم سُرمہ سا کیا ہے
سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں
ابر کیا چیز ہے؛ ہوا کیا ہے

٭

وہ اس قدر اعلےٰ ظرف اور بندگی میں آزادہ و خود بیں ہے کہ دو جہاں لے کر بھی خوش نہیں ہوتا۔ "

دَرِ کعبہ بند ہونے کی صورت میں اس کے کھلنے تک انتظار اپنی بشریت کے منافی سمجھتا ہے۔ اور جملہ مظاہر فطرت کو بھی خود سے کم تر —— اس کے نزدیک دشتِ امکان اور اسی کائنات ارضی کی حقیقت ایک "نقشِ پا" اور "بازیچۂ اطفال" سے زیادہ نہیں۔ اس کو یہ علم بھی ہے۔ کہ زندگی میں انسان کے لئے اہم ترین شے خود اس کی اپنی

ذات ہے جو "محشر خیال" بھی ہے۔ اور "انجمن" بھی۔ وہ اس قدر مستقل مزاج اور باحوصلہ ہے۔ کہ ناکامیوں سے دل شکستہ نہیں ہوتا۔ بلکہ ایک عزم اور ذوق کے ساتھ تسخیر کائنات کے لئے ہمہ وقت مصروف جہد رہتا ہے۔ اور دیر و حرم کو بھی اپنے شوق کی گردِ راہ سمجھتا ہے۔

دونوں جہان دے کے وہ سمجھے یہ خوش رہا
یاں آپڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں !

٭

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود بیں ہیں کہ ہم
الٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا ــــ!

٭

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یا رب
ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقش پا پایا !

٭

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے
جز نام نہیں صورتِ عالم مجھے منظور
جز وہم نہیں ہستیٔ اشیاء مرے آگے
ہوتا ہے نہاں گرد میں صحرا مرے ہوتے
گھِستا ہے جبیں خاک پہ دریا مرے آگے

٭

ہے آدمی بجائے خود ایک محشرِ خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

٭

ہوں میں بھی تماشائی نیرنگِ تمنا
مطلب نہیں کچھ اس سے کہ مطلب ہی بر آوے

نہ ہوگا یک بیابان ماندگی سے ذوق کم میرا
حباب موجۂ رفتار ہے نقش قدم میرا

٭

دیر و حرم آئینۂ تکرارِ تمنا!
واماندگیٔ شوق تراشے ہے پناہیں

٭

غالب کا انسان اپنے ہم جنس کو بلا تخصیص رنگ و نسل مذہب و ملت اور ملک و قوم برابر بھی سمجھتا ہے۔ اور اس سے ہمدردی بھی رکھتا ہے۔ غالب نے خود ایک خط میں لکھا ہے سے

"میں تو بنی آدم کو مسلمان ہو یا ہندو یا نصرانی عزیز رکھتا ہوں اور اپنا بھائی گنتا ہوں" وہ رسم و روایت کو انسانیت اور ایمان دونوں کے اعلےٰ مقاصد کے منافی سمجھتا ہے۔ وہ اس قدر خود بین اور خود پسند ہے۔ کہ کسی کا احسان اٹھانا بھی اپنی خودی اور عزت نفس کے منافی سمجھتا ہے۔ وہ حلم و بردباری اور عفو و درگزر کی اعلےٰ انسانی اقدار کا بھی قائل ہے۔ اور دوسروں کو یہ سبق دیتا بھی دکھائی دیتا ہے۔ کہ اگر کوئی بُرا کہے تو جواباً بُرا کہنا اور خطا کار سے بدلہ لینا انسانی شان کے منافی ہے۔ آدمی سے غلطی ہو ہی جاتی ہے۔ بہتر تو یہ ہے کہ اسے معاف کر دیا جائے۔ لیکن کسی گم گشتہ راہ کی رہبری اپنا فرض اولین سمجھنا چاہیئے۔ وہ انسانی مقاصد کی تکمیل تک اس کائنات میں قیام رکھنا ضروری سمجھتا ہے۔ اور اپنی نگہ کرم سے خس و خاشاک گلستاں کو اس لئے درخشندہ و تابندہ کر دیتا ہے کہ آئندہ آنے والوں کے لئے وہ چراغ کا کام دے سکیں وہ آدمی کو آدم زادہ ہی جانتا اور سمجھتا ہے۔ جس سے غلطیاں سرزد ہو سکتی ہیں اس کے نزدیک خطا اور گناہ ہی وہ امتیازی علامت ہے۔ جو انسان اور فرشتے کے درمیان ایک حد قائم رکھتی ہے لیکن وہ خدا کو غفور الرحیم سمجھتا ہے۔ اور خود کو اس کی رحمت کا امیدوار۔ جو اپنی رحمت اور کرم نوازی سے گناہوں کو معاف کر دیتا ہے سے

ہم موحّد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسُوم
ملّتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

٭

صد جلوہ روبرو ہے جو مژگاں اٹھائیے
طاقت کہاں کہ دید کا احساں اٹھائیے!
دیوار بارِ منّتِ مزدور سے ہے خَم
اے خانماں خراب نہ احساں اٹھائیے

٭

نہ سنو گر بُرا کہے کوئی
نہ کہو گر بُرا کرے کوئی
روک لو گر غلط چلے کوئی
بخش دو گر خطا کرے کوئی

٭

خون ہو کے جگر آنکھ سے ٹپکا نہیں اے مرگ
رہنے دے مجھے یاں کہ ابھی کام بہت ہے

٭

نِگہ گرم سے اک آگ ٹپکتی ہے اسدؔ
ہے چراغاں خس و خاشاکِ گلستاں مجھ سے

٭

خوئے آدم دارم آدم زادہ ام!
آشکارا دم زِ عصیاں می زنم!

٭

غالبؔ کے تصورِ انسانیت کا یہ مطالعہ بڑا ہی نامکمل اور ایک نقش ناتمام رہ جائے گا۔ جب تک کہ ہم اقبال کے انسان کا بھی اجمالی جائزہ نہ لیں اور پھر دونوں کا آپس میں تقابل نہ کریں۔ اقبال اپنے انسان کی شیرازہ بندی اس

سیاسی ماحول میں کرتا ہے۔ جب کہ سامراجیت اپنے عروج پر تھی۔ فرنگی اقتدار ساری دنیائے اسلام پر اپنی گرفت مضبوط کرتا جا رہا تھا۔ اور امت مسلمہ اس گرفت میں بری طرح کراہ رہی تھی۔

یہ مشاہدہ ہے۔ کہ جب انسان میں مشکلوں سے برد آزما ہونے کا جذبہ کمزور پڑ جاتا ہے۔ تو وہ تقدیر کا سہارا لے کر صبر و شکر کے ساتھ ہاتھ پہ ہاتھ دھر کر بیٹھ جانا ہی سب کچھ سمجھتا ہے۔ چنانچہ اس وقت بھی مسلمانوں کے دلوں میں عزم و ہمت کی کمی سے شکست خوردگی اور انفعالیت کا جذبہ روز بروز فزوں ہوتا جا رہا تھا۔ اتحاد عمل اور یقین محکم سے اذہان خالی ہو گئے تھے۔ یاسیت اور ادبار کے اندھیروں میں کہیں سے امید کی کرن پھوٹتی نظر نہ آتی تھی۔

چنانچہ ان مایوس کن حالات میں ایسے انسان کے تصور کی ضرورت تھی جو مسلمانوں کو اسلام کی صحیح روح اور صراط مستقیم سے پوری آگاہی بخش دے اور ان میں وہ ہمت مردانہ پیدا کر دے جس کی بدولت وہ حقائق کا ڈٹ کر مقابلہ بھی کر سکیں۔ اور اپنے روز و شب بھی اپنی مرضی کے مطابق بدل سکیں چنانچہ اقبال کا انسان عرفان و آگہی اور علم و عمل کی آمیزش اور آویزش کا وہ اعلےٰ مجسمہ ہے۔ جس میں صفات الٰہیہ بھی موجود ہیں اور اعلےٰ عملی صلاحیتیں بھی وہ اپنی زندگی میں جہد مسلسل اور ضبط نفس سے عرفانِ ذات بھی حاصل کر لیتا ہے اور عرفانِ الٰہی کے اعلےٰ مقام پر بھی پہنچ جاتا ہے۔ اور جب یہ گیان حاصل ہو جاتا ہے تو وہ مردِ مسلمان بھی بن جاتا ہے۔ اور نائب خدا بھی۔ جس کی حکومت خدا کی حکومت اور جس کا ہاتھ خدا کا ہاتھ ہو جاتا ہے۔ جس سے وہ مسائل حیات کی عقدہ کشائی بھی کرتا ہے ہر نقش ماسوا کو مٹا بھی دیتا ہے۔ اور رموزِ جزو و کل سے لوگوں کو آشنا بھی کرتا ہے۔ اس کے کردار میں گفتار میں ہر لحظہ نئی شان اور نئی آن پیدا ہو جاتی ہے۔ اور اس کا دل اس قدر مستغنی ہو جاتا ہے کہ وہ دونوں عالم کو بھی خاطر میں نہیں لاتا۔ اور خدا خود نوشتۂ تقدیر سے قبل اس کی رضا پوچھ لیتا ہے۔ وہ موت سے کبھی نہیں ڈرتا۔ موت اس کے نزدیک زندگی کے ارتقائی سفر کی ایک منزل ہے۔ صرف جسم فنا ہو جاتا ہے۔

روح فنا نہیں ہوتی ؎

نائبِ حق ہمچو جانِ عالم است
ہستیٔ او ظلِ اسمِ اعظم است

*

از رموزِ جزو و کل آگاہ بود،
در جہاں قائم بامر اللہ بود،

*

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن
گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان
قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان!

*

مومن از عزم و توکل قاہر است
گر نہ دارد ایں دو جوہر کافر است

*

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں کارکشا کارساز
خاکی و نوری نہاد بندۂ مولا صفات
ہر دو جہاں سے غنی اس کا دلِ بے نیاز

*

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

*

غالب اور اقبال نے انسانیت کا جو تصور اپنی شاعری میں پیش کیا ہے اس کا تقابلی جائزہ لینے سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ اقبال کا انسان ایک

مرد مسلمان ہے اور غالب کا انسان ایک آفاقی انسان ۔

اقبال کا انسان وہ ہے۔ جس کی تخلیق نور ایمانی اور جذبہ و عمل کے تال میل سے ہوتی ہے۔ جو مسلمان کو مادی اور روحانی کامیابیوں کی راہ پر گامزن کردیتا ہے۔ اس کے نزدیک اسلام ہی مکمل ضابطہ حیات ہے۔ اور سیاست بھی دین سے علیحدہ کوئی شے نہیں۔

اس کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے۔ کہ اس نے مسلمان کو نظریہ وحدۃ الوجود کی اسیری سے آزاد کرانے کی مقدور بھر کوشش کی۔ اقبال کے "انسان کامل" کا تصور بھی وہ ہے۔ جس کے متعلق خود اسلامی عقیدہ یہ ہے۔ کہ وہ نائب خدا ہے۔ اس جیسا نہ دوسرا کبھی پیدا ہوا ہے۔ اور نہ ہو سکے گا۔ اور ہم بحیثیت مسلمان اس بات پر یقین بھی رکھتے ہیں۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ ہر انسان کے لئے یہ تصور قابل قبول بھی ہو اور قابل عمل بھی اور ایسے انسان کی قدر و منزلت اور تکریم و تعظیم صرف مسلمانوں کے دلوں ہی میں رہ سکتی ہے۔ اور اس میں شک نہیں کہ وہ ان کی ہمہ وقت رہبری و رہنمائی کرتا رہے گا۔

لیکن ـــــ غالب کا انسان وہ ہے۔ جس کی عزت و عظمت ہر زمانے میں اور ہر جگہ بلا تخصیص مذہب و ملت قائم و برقرار رہے گی۔ کیونکہ وہ انسانیت کی ان اعلےٰ اقدار کی نمائندگی کرتا ہے۔ جو زمان و مکان اور قوم و نسل سے بالاتر ہیں۔ اور سب کے لئے قابل قبول ہیں اور حقیقت بھی یہ ہے۔ کہ رنگ و نسل مذہب و ملت اور زمان و مکان کی پابندیاں ہی انسان کے دل میں ایکدوسرے سے اکثر نفرت اور لاتعلقی کا جذبہ پیدا کردیتی ہیں۔ جس سے انسان دوستی کا جذبہ گھٹ کر رہ جاتا ہے۔

اس کے علاوہ اقبال کے انسان کی تشکیل " قہاری، غفاری ، قدوسی اور جبروت کے عناصر سے ہوتی ہے۔ اس میں محبت اور عفو و درگزر کا وہ ہمہ گیر اور لازوال جذبہ مشکل ہی سے ملتا ہے۔ جو غالب کے انسان میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ یہ ضرور ہے کہ غالب وحدۃ الوجود کے نظریہ کے خلاف اس کامیابی کے ساتھ آواز بلند نہیں کرسکے۔ جس طرح اقبال نے کی ہے۔ لیکن اس سے بھی انکار

نہیں کیا جاسکتا۔ کہ غالب کی آواز اپنے دور میں بالکل علیحدہ اور الگ تھلگ سنائی دیتی ہے اور دونوں کا تقابلی جائزہ لیتے وقت اس حقیقت کو بھی فراموش نہیں کرنا چاہیئے۔ کہ اقبال کو جو مواقع اور سہولتیں سائنس، فلسفے، مغربی اور اسلامی علوم حاصل کرنے کی میسر آسکیں۔ وہ غالب کو حاصل نہ تھیں اس کے باوجود غالب نے اپنے شعر وادب اور فکر وعمل سے انسان کی اعلےٰ خصوصیات کے وہ پر خلوص چراغ روشن کئے ہیں کہ ان کی دل آویز روشنی آج بھی برصغیر ہند وپاک سے نکل کر دنیا کے طویل وعریض گوشوں تک پہنچ رہی ہے۔ اور لاتعداد انسانوں کے دلوں کو منور کر رہی ہے۔

بہرکیف! غالب انسانیت کی جستجو اور تلاش میں زندگی کے ہر موڑ پر رکتا اور ہر منظر حیات پر گہری نظر ڈالتا دکھائی دیتا ہے۔ اور جس جگہ اور جس مقام پر اسے تسکین ذوق کا سامان مہیا ہوتا نظر نہیں آتا وہاں ذرا رک کر آگے بڑھ جاتا ہے۔ اور جو بھی ناکامیاں اور نامرادیاں درمیان راہ آتی ہیں ان سے اس کے دل میں کدا ختگی تو پیدا ہو جاتی ہے لیکن پاشکستگی کا احساس پیدا نہیں ہوتا۔ یہ ضرور ہے۔ کہ وہ اس سفر میں مستقل رہبری حاصل کرنا یا کسی کو اپنا ہم سفر بنانا اپنی خودی کے منافی سمجھتا ہے۔

اس کی یہی خود اعتمادی اسے مسلسل رواں دواں رکھتی ہے۔ جس سے وہ اندھیروں میں بھی اجالا کر لیتا ہے، اور اپنی اعلےٰ صلاحیتوں اور توانائیوں سے الجھی ہوئی اور ٹیڑھی راہوں سے بھی علیحدہ راہ نکال لیتا ہے۔ جو اسے واقفیت ذات اور عرفان ذات کے مقام تک پہنچا دیتی ہے اور یہی انسانیت کے وہ اعلےٰ مقامات ہیں جہاں تک پہنچ جانا ہر آدمی کے بس کی بات نہیں اسی لئے وہ کہتا ہے۔

بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

غالبؔ ـــــ تہذیبی سنگم پر [1]

غالبؔ کا معاشرہ دو تہذیبی رجحانات سے عبارت تھا۔ ایک رجحان وہ تھا جس کی تہذیبی روایت صدیوں پر پھیلی ہوئی تھی اور اب ختم ہو رہی تھی۔ دوسرا رجحان اس تہذیب سے متعلق تھا۔ جو نئی تبدیلیوں نئے تقاضوں اور نئی جدتوں کے ساتھ دبے پاؤں فرد کی زندگی میں داخل ہو رہی تھی۔

جس کا اثر معاشرے کے افراد پر علیحدہ علیحدہ تھا۔ کچھ لوگ نئی طرز زندگی کو اچھی نظر سے دیکھ رہے تھے۔ ان کا خیال تھا۔ کہ یہ نہ صرف سماج میں فرد کے احترام کا سبب بنے گی بلکہ انسان کو نئی رفعتوں سے ہمکنار کرنے کا وسیلہ بھی ٹھہرے گی۔ بعض اسے اپنے تہذیبی مزاج اور رسم و روایت کے منافی سمجھ رہے تھے جس کے سبب ان کے دل مستقبل کے اندیشوں سے لرزاں اور ترساں تھے۔ لیکن اس وقت معاشرے کا ایک بڑا طبقہ ایسا بھی تھا۔ جو زمانے کی رو میں ایک نئی لہر کی ہنگامہ خیزیوں سے قطعی ناواقف تھا۔ اور قدیم روش اور روشنی میں فکر فردا سے بے نیاز، اپنے حال میں مست بڑی بے فکری سے چل پھر رہا تھا۔ افراد کی ان ہی مختلف ذہنی کیفیات اور فکری ترغیبات نے

---

[1] نقوش غالب نمبر ۱۹۷۱ء

معاشرے کی زندگی میں یقین کے ساتھ بے یقینی اور اطمینان کے ساتھ بے اطمینانی کی ایک مخصوص فضا پیدا کردی تھی۔ غالب نے اس فضا کو بہت قریب سے دیکھا جس کا موقع غالب کو اس اعتبار سے زیادہ ہی ملا کہ وہ ایسے خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ جس کا مقدر سیاسی اتار چڑھاؤ کے ساتھ بنتا بگڑتا رہتا ہے حالانکہ غالب نے پیشۂ آباء اختیار نہ کیا تھا۔ اور کہنے کو ایک مرحلہ پر یہ بھی کہہ گئے تھے ـــــ۔

کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے ـــــ۔ لیکن حقیقت حال یقیناً اس کے برعکس رہی اور وہ متاع ومرتبت جو ان کے آبا شمشیر چلا کر حاصل کر لیا کرتے تھے۔ غالب اس کو قلم چلا کر حاصل کرنے کے متمنی رہے۔ لیکن یہ حسرت۔ حسرت ہی رہی۔ اور ان کی زندگی کا زیادہ تر انحصار پیشۂ آباء کے ثمرات پر ہی رہا۔ مگر یہ ثمرات بھی سیاسی مصلحتوں اور ہنگامہ خیزیوں کے باعث ہمیشہ غیر یقینی اور ناکافی رہے۔ اور غالب کو زندگی میں کبھی پورا اطمینان نصیب نہ ہوسکا۔ لیکن قابل تعریف بات یہ ہے۔ کہ ان کی حیثیت کبھی خاموش تماشائی کی سی نہیں رہی۔ اور زندگی کا وہ تماشہ جو شب و روز ان کے آگے ہوتا رہا۔ اسے غالب نے اپنی قلبی واردات اور ذہنی محسوسات کا رنگ دے کر پوری توانائی اور تابناکی کے ساتھ اپنے شعر و ادب میں پیش کر دیا ہے۔ اسی لئے ان کی تخلیقات میں عصری زندگی کی جیتی جاگتی تصویریں بھی ملتی ہیں۔ اور محرومیوں اور نارسائیوں کا شدید احساس بھی ـــــ ـــــ ان میں ذہنی توانائیوں اور ناتوانائیوں کی روح عصر بھی مقید ہے اور وہ پیار بھری نظر بھی جو انسان کو دنیا کی دشواریوں کا مقابلہ کرنے کی جرأت بخشتی ہے۔ ان سے نہ صرف مخصوص زندگی کی رہ رزیت جھانکتی نظر آتی ہے۔ بلکہ ماضی کی تہذیبی بو باس کا رچاؤ بھی ملتا ہے۔ اور مستقبل کی آرزوؤں کا تصور بھی اور اس میں شک نہیں کہ ایک فن پارہ انتہائی اجمال و اختصار کے باوجود اپنے عہد کی مکمل تاریخ ہوتا ہے۔ لیکن قطرہ میں دجلہ کو تب ہی دیکھا جا سکتا ہے۔ جب دجلہ کی وسعت و اہمیت اور کیفیات و ہیجانات کا نقشہ ذہن میں کسی قدر موجود ہو پھر ایسے ادب کا مطالعہ تہذیبی اور تاریخی پس منظر میں کرنا اور بھی ضروری ہو جاتا ہے

جو دو تہذیبوں کا سنگم قرار دیا جاسکتا ہو۔

غالب مغل تھے۔ اور ان کے دادا مرزا قوقان بیگ شاہ عالم ثانی کے عہد میں (۱۷۵۹ — ۱۸۰۶ء) سمرقند سے دہلی آئے اور مغل بادشاہ کے نوکر ہوئے۔ یہ زمانہ مغلوں کے زوال کا تھا۔ اور ان کی سلطنت کا شیرازہ تیزی سے بکھر رہا تھا۔ مقبوضات پر ان کی گرفت ڈھیلی پڑ چکی تھی۔ بغاوتیں کامیاب ہوتی جارہی تھیں۔

یوں تو زوال کی ابتداء اورنگ زیب کے انتقال کے بعد ہی سے شروع ہو چکی تھیں لیکن چند برسوں میں اس کی رفتار کافی تیز ہو گئی۔ جس کی بڑی وجہ غالباً یہی تھی۔ کہ اورنگ زیب کے جانشینوں میں نہ اپنے اجداد کی سی طاقت باقی رہی تھی۔ اور نہ صلاحیت کہ وہ پیش آمدہ مسائل کو مصلحت بینی یا بصورت دیگر طاقت سے حل کر سکتے۔

جبکہ لذت پرستی اور عشرت کوشی ان کا شعار زندگی بن چکا تھا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ محمد شاہ کے عہد میں (۱۷۱۹ — ۱۷۴۸ء) جنوبی اور شمالی مشرقی ہند کے بیشتر صوبے عملی طور پر مغلیہ حکومت کے اثر و اقتدار سے آزاد ہو گئے یہ جاٹ، روہیلے اور سکھ سیاسی طاقت کی حیثیت سے ابھرے اور دتی اور اس کے ملحقہ علاقوں پر کئی بار حملہ آور ہوئے۔ خود دہلی میں طاقت ور امراء اور وزراء حکومت کے اعلیٰ مناصب کے لئے برسرِ پیکار رہنے لگے۔ اور جو غالب آتا امور سلطنت پر خود حاوی ہو جاتا۔ اور بادشاہ وقت ان کے زیر اثر برائے نام حکمراں رہتا۔

ادھر نادر شاہ کے حملہ نے مغلیہ سلطنت کی رہی سہی شان و شوکت کو نہ صرف بڑا دھکا پہنچایا۔ بلکہ شاہی خزانہ خالی ہو گیا۔ اور اس دہلی کی اینٹ سے اینٹ بج گئی۔ جس کے گلی کوچے کبھی "اوراق مصور" سے کم نہ تھے۔ اس کے بعد بھی احمد شاہ کے پے در پے حملے اور امراء کی سازشیں برابر جاری رہیں۔ جس کی وجہ سے دہلی آپس کے حسد و نفاق اور رقابتوں کی نہ صرف آماجگاہ بن گئی۔ بلکہ مار دھاڑ لوٹ کھسوٹ۔ قتل و غارت اور معاشی بدحالی اس کا مقدر بن گئی اہل حرفہ اور صاحب فن کا کوئی پرسان حال نہ رہا۔ وہ اپنی عزت بچا کر دہلی سے لکھنو۔ فرخ آباد۔

بلب گڑھ۔ فیض آباد اور عظیم آباد کی طرف ہجرت کر رہے تھے۔ فوج کی حالت بھی بڑی ابتر تھی۔ سپاہیوں کو کئی کئی ماہ تنخواہ نہ ملتی اور وہ خورد و نوش کی خاطر ڈھال اور تلوار تک بنیئے کے پاس رہن رکھنے پر مجبور ہو جاتے دہلی کے ان حالات و کیفیات کی منہ بولتی تصاویر سوداؔ کا قصیدہ شہر آشوب اور قصیدہ تضحیک روزگار میرؔ کا مخمس در حال لشکر اور ذکر میرؔ اور حاتمؔ کا مخمس شہر آشوب ہیں

شاہ عالم ثانی بھی مرہٹوں کے زیر اثر بادشاہ تھا۔ اس کی آنکھیں غلام قادر نے ۱۷۸۵ء میں نکلوا دی تھیں۔ اس وقت سے وہ کاروبار سلطنت سے بڑی حد تک دستکش ہو گیا تھا۔ آخر ۱۸۰۳ء میں لارڈ لیک نے سندھیا کو بھی شکست دے کر دہلی فتح کر لی۔ اور اب انگریز ہندوستان کی سرحدوں کا نگہبان اور مغل بادشاہ کا پاسبان بن گیا۔ جس سے دہلی بیرونی حملوں سے محفوظ ہو گئی ایک لاکھ پچیس ہزار روپیہ ماہوار مغل بادشاہ کی پنشن مقرر ہوئی۔ ساتھ ہی قلعہ پر اختیار سکّہ اور شاہی ادب و آداب باقی رہے۔ لیکن یہ صورت بھی زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہ سکی۔

اکبر شاہ ثانی اور بہادر شاہ ظفرؔ کے عہد میں انگریزوں کے اثر و اقتدار کی گرفت کافی سخت ہو گئی۔ مغل بادشاہوں اور شہزادوں کی نہ صرف پنشن کم کر دی گئی بلکہ وہ اقتدار بھی باقی نہ رہا جو پہلے تھا۔ اور کیننگ نے تو یہاں تک طے کر دیا تھا کہ بہادر شاہ ظفرؔ کے بعد خطابات شاہی بھی منسوخ کر دیئے جائیں گے۔ لیکن ۱۸۵۷ء کے غدر نے یہ موقع ہی نہ آنے دیا۔ اور مغلیہ دور کی وہ آخری شمع جو "داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی" رہ گئی تھی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئی۔ اور اس طرح وہ مخصوص تہذیبی روایت جو مغل سلطنت کے ساتھ وابستہ تھی ختم ہو گئی۔

مغلیہ عہد کے اس ہنگامہ خیز دور پر ایک تجسس آمیز نگاہ ڈالی جائے تو کچھ ایسے عناصر بھی سامنے آتے ہیں۔ جنہوں نے اس وقت دربار سے باہر دلّی کے سماج میں ایک مخصوص مقام حاصل کر لیا تھا۔ جس کی وجہ سے دلّی اور اس کے ارد گرد ایک منفرد، ادبی اور تہذیبی فضاء پیدا ہو گئی تھی۔ اس کی ایک صورت تو یہ تھی کہ وہ چھوٹے چھوٹے ہندوستانی امراء اور سردار جنہوں نے اپنے علاقوں میں سیاسی قوت

حاصل کرکے چھوٹی چھوٹی خودمختار یا نیم مختار ریاستیں اور جاگیریں قائم کرلی تھیں وہ اپنے دیوان خانوں اور محفلوں کی تزئین و آرائش درباری شاہوں کی نہج پر کرنا چاہتے تھے۔ جس میں ادبی کوششوں کو سراہنا اور شعرا کی سرپرستی کرنا بھی شامل تھا لیکن وہ فارسی سے کہیں زیادہ اردو کے دلدادہ تھے۔ اور اپنے گرد و پیش ریختہ گو شعرا کی موجودگی کو پسند کرتے تھے۔

فارسی ویسے بھی سرکاری اور درباری زبان ہونے کی وجہ سے خواص کی زبان تھی۔ جسے ایرانی اور تورانی النسل صرف اپنا ہی ورثہ سمجھتے تھے۔ اور ہندی فارسی داں لوگوں کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ یہ مغائرت بھی ہندی علماء اور شعراء کے لئے کسی قدر تکلیف دہ تھی۔ اور وہ اپنی شخصیت اور تہذیب کے اظہار کا مناسب و موزوں ذریعہ ریختہ ہی کو سمجھ رہے تھے۔

ادھر عوام اپنے خیالات کے اظہار و بیان کے لئے اپنے مزاج اور ماحول سے قریب تر عام فہم اور بے ساختہ ذریعہ اظہار کے طلبگار تھے۔ اور ایسا وسیلۂ اظہار چاہتے تھے۔ جس میں ہندوستانی فضا بھی موجود ہو اور ایرانی تہذیبی سرمایہ کی روایت بھی ـــــ چنانچہ انہیں ریختہ میں ہی ابنائے وطن کے اظہار و بیان کی مضطرب امید دل کی تسکین اور اپنے خواب و خیال کی تعبیر اور تفسیر نظر آرہی تھی اس لئے اس کی ترویج و شہرت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا شروع کردیا۔ جس کے نتیجہ میں ہی مشاعروں کی بجائے مراختوں کا رواج پڑا۔ اور چند خواص کو چھوڑکر ہر طبقے ہر شعور اور ہر مشرب کے لوگ اردو شعر گوئی میں کافی دلچسپی لینے لگے۔ یہاں تک کہ اردو تبلیغ و اظہار کا ایک موثر اور وسیع ذریعہ بن گئی۔ جس کا اظہار حافظ محمود شیرانی نے تذکرہ مجموعہ نغز کے دیباچے میں اس طرح کیا ہے۔

" مسلمان ہندو بلکہ فرنگی زادوں تک میں یہ ذوق سرایت کرگیا تھا سلاطین عمال و امراء علماء و سپاہ و اہل ایوان کے علاوہ ہر طبقہ کے پیشہ وروں پر شاعری کا رنگ چڑھا ہوا ہے۔

مثلاً نظیر صیقل گر ہے اگرچہ اچھے خاندان سے تعلق رکھتا ہے محمد امان نثار معمار ہیں جامع مسجد دہلی ان ہی کے بزرگوں کی بنائی ہوئی ہے۔ یہ وہی نثار ہیں

جنھوں نے میرؔ کے اژدرنامہ کے جواب میں بدیہہ نظم پڑھ کر اہل مشاعرہ سے خراج تحسین وصول کیا اسی طرح حسین بخش پارچہ فروش ہے۔ مدھ سنگھ شگفتہ آہن گر ہے ————————

—— خواجہ مہنگا شیدا علاقہ بند ہے۔ میر صادق علی خان صادق نیل بان ہے شمبھو ناتھ عزیز مہاجن ہے۔ میر لطیف علی لطیف جواہرات کا دلّال ہے اور مغل علی معقل علاقہ بند اور سوداگر ہے۔ بدرالدین مفتون بزازہ اور یک رنگ سنار ہے محمد ہاشم شائق خیاط ہے اس کے ساتھ مرثیہ خوانی کی خدمت کو بھی ضم کرلیا ہے۔ اور کافی شہرت رکھتا ہے۔ محمد عارف رفو گر ہے۔ عنایت اللہ عرف کلّو حجام ہے۔ اور حضرت مولانا فخرالدین کی موتراشی کرتا ہے۔ شعر میں میاں کلّو کو سوداؔ کے تلمذ پر فخر ہے مذاق اس قدر بلند ہے۔ کہ سوداؔ کے سوا کسی کو شاعر بھی تسلیم نہیں کرتے غلام ناصر حراج ہے۔ مقصود ایک سقہ ہے۔ جو فن شعر میں بازار کے لونڈوں کا استاد ہے ۔لا قرین ایک خاکروب ہے۔"

اس کے علاوہ ریختہ کی مقبولیت عام کی دوسری وجہ یہ ہوئی۔ کہ اب درباروں میں وہ پہلے سی سکت اور دم درود باقی نہ رہا تھا۔ کہ ہر شاعر اور ہر اہل فن کی حوصلہ افزائی صلہ اور معاوضہ سے کی جاتی۔ اب تو تعریف و توصیف اور عزت و شہرت کی جگہ عام محفلیں اور مجلسیں تھیں اور ان محفلوں کی مقبول زبان ریختہ یا ہندی تھی بلکہ غالب کے دور میں تو اُردو نے اس قدر مقبولیت حاصل کر لی تھی کہ قلعہ معلےٰ میں بھی مشاعروں کی جگہ مراختوں نے لے لی تھی جن میں بہادر شاہ ظفر کے علاوہ کئی شہزادے بھی ریختہ ہی میں کلام کہتے اور سناتے تھے۔ اگر ان عصری رجحانات و عوامل کو ذہن میں رکھا جائے۔ تو اس حقیقت کا ادراک بخوبی ہو جاتا ہے۔ کہ اردو شاعری کا یہ رواج دربار شاہی کا مرہون منت نہ تھا۔ بلکہ اس تہذیبی اور ثقافتی زندگی کا مظہر تھا جو ہند عجمی عناصر کی باہمی کشمکش اور ٹکراؤ سے معرض وجود میں آیا تھا۔ یہی کشمکش محمد شاہی دور کے فن موسیقی میں جلوہ گر نظر آتی ہے۔ جو ہندی اور فارسی کے خوشگوار تال میل اور میل جول سے ایک متوازن راہ اور ایک متوسط روش اختیار کر سکی جس کی واضح ترین مثال نعمت خان سدا رنگ کی ٹھمریوں اور خیال کی زبان سے ملتی ہے۔ سدا

رنگ کی ایک ٹھمری کی زبان بعز من ملاحظہ پیش ہے

"جانے نہ دوں گگری بھرن کو —— سدا رنگیلے ٹھاڑو ٹٹ پر —— بوند بوند چاروں اور —— جانے نہ دوں گی پیا کو —— میں تو راکھوں گی نینوں میں موند موند —— رین اندھیری کاری بجری چمکے —— سدا رنگ پیا —— ینگ نہ لاگے میہنا برسے بوند بوند ——"

دلّی کی تہذیبی زندگی کی دوسری صورت بازاروں کی چہل پہل میلوں ٹھیلوں کی رونق ۔ ناچ گانے ، عرس قوالی ۔ مشاعروں اور مراختوں پر منحصر تھی اور عام زندگی اس سیاسی انتشار واضطراب سے بہت کم آشنا نظر آتی تھی جس نے مغل بادشاہوں اور جاگیرداروں کے محلات میں ہلچل اور سراسیگی پھیلا رکھی تھی۔

معلوم ایسا ہوتا ہے۔ کہ اس وقت تک عوام کو سماجی انحطاط کا صحیح اندازہ نہ تھا یہی وجہ تھی کہ ان کی زندگی رنگین اور پر بہار تھی۔ انہیں مذہب اور تصوّف کے ساتھ بھی خاص لگاؤ تھا۔ اور حسن پرستی اور موسیقی کے ساتھ بھی گہری دلچسپی تھی۔ جس کا تذکرہ ڈاکٹر محمد حسن[۱] نے اس انداز میں کیا ہے۔

"بسنت کے موقع پر قدم شریف پر صبح وشام مجمع لگتا تھا۔ سارا شہر دلہن کی طرح سجتا تھا۔ باموں میں فرش بچھتے ۔ قوالیاں ہوتیں اور پری پیکراں نازنین تماشائیوں کے حوصلے آزماتی تھیں۔ ——— مطربانِ رنگین ونوخیز اور قوالانِ معمّر اپنے حسن وکمال سے لبھاتے دوسرے دن نغمہ طراز حضرت قطب الاقطاب کی درگاہ پر واپس آتے تیسرے دن حضرت سلطان المشائخ کی درگاہ میں محفل سماع جمتی چوتھے دن حضرت رسول نما میں جہاں قوالوں اور نقالوں کا ہجوم ہوتا —— پانچویں دن حضرت شاہ ترکمان کی درگاہ میں اور چھٹے دن بادشاہ اور امراء کی طرف رجوع کرتے ۔"

چنانچہ ان مذہبی اور نیم مذہبی ہنگاموں اور محفلوں کا یہ نتیجہ نکلا کہ ایک طرف ریختہ کے رواج عام میں بڑی مدد ملی دوسری طرف تصوّف کی جڑیں سماجی زندگی میں اس قدر گہری پیوست ہوگئیں کہ مضبوط وتناور درخت کی صورت میں نمودار ہو کر تہذیبی زندگی پر سایہ افگن ہوگئیں۔

---

[۱] دہلی میں اردو شاعری کا تہذیبی اور فکری پس منظر ۔ مصنفہ ڈاکٹر حسن ص ۵۹

اس دور میں تصوف کا کیا رنگ و روپ تھا۔ کس قدر اور کس انداز میں اپنایا گیا۔ مختلف خانوادوں نے اس کے کیا کیا ادب و آداب اور طور طریق متعین کر رکھے تھے۔ اس سے قطع نظر یہ بات بڑے وثوق سے کہی جا سکتی ہے۔ کہ تصوف کی مقبولیت اور جاذبیت اس معاشرہ میں ہمیشہ بڑھتی ہے۔ جہاں انسان سیاسی اور اقتصادی حالات سے برد آزما ہونے کی صلاحیت خود میں نہیں پاتا۔ اور اپنے آپ کو مجبور و بے بس سمجھ لیتا ہے۔ اور اس کی مقبولیت اس ماحول میں یقیناً گھٹتی ہے۔ جہاں ابن آدم اپنی فکر و نظر اور عزم و حوصلے سے اپنی صبح و شام بنانے، سنوارنے اور نئے راستے نکالنے اور تراشنے میں ہمہ تن مصروف رہتا ہے۔

ہندوستان کا یہ دور بھی جیسا کہ اوپر تذکرہ آچکا ہے۔ سیاسی ہیجانات اور ارتعاشات کا دور تھا۔ جس میں انسان وقت کے دھاروں اور زمانے کے تیور سمجھنے سمجھانے اور دیکھنے بھالنے کی صلاحیت سے بڑی حد تک محروم ہو چکا تھا۔ فکری گہرائی اور نظریاتی اصابت کے لئے جس سیاسی استقلال اور جس ذہنی سکون کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ اس وقت موجود نہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس زمانے کے فرد میں مشکلات پر قابو پاکر آگے بڑھنے کی نہ اپج تھی۔ اور نہ حوصلہ —— اس کی نظر بس اُن ناخوشگوار واقعات و حالات پر پڑ رہی تھی۔ جو تیزی سے وقت کے پردے پر گزر رہے تھے۔ اور ان سے مدافعت کی قوت خود میں نہ پاکر معمولی معمولی خوشیوں اور وقتی مسرتوں کے نشہ میں بے خود رہنے کا آرزو مند تھا۔ اور اپنی اس بیخودی کی خاطر ایک فکری پناہ گاہ اور ایک ذہنی جائے عافیت کا متلاشی تھا۔ جو اس نے تصوف اور اہل تصوف کے طریقوں اور راہوں میں تلاش کر لی تھی۔

تصوف کی تعلیم و تربیت کے مطابق جہاں عشق حقیقی کا اعلیٰ و ارفع مقام مختلف جانکاہ مشقتوں اور جگر سوز ریاضتوں سے حاصل ہوتا ہے۔ وہاں عشق مجازی کی آڑ میں حسن پرستی۔ جنسی آسودگی اور محفل سماع کی گنجائش بھی نکل آتی ہے۔ اور اس طرح ایک انسان تصوف کے ذریعہ اپنی طبیعت اور خواہش کے مطابق تصفیہ قلب

ل‍ه دہلی میں اردو شاعری کا تہذیبی اور فکری پس منظر مصنفہ ڈاکٹر محمد حسن صہ ۵۹

کا راستہ بھی اختیار کر سکتا ہے۔ اور وہ طریقہ بھی جو لذت جسم و نگاہ کا سامان مہیا کر سکے۔ اس کے علاوہ تصوّف کی مقبولیت کی وجہ یہ بھی رہی ہے۔ کہ اس کی روایت انسان دوستی، وسیع المشربی آزاد خیالی انصاف پسندی۔ ہمدردی اور ایثار و قربانی کی ان اعلیٰ اخلاقی صفات پر بھی زور دیتی ہے۔ جو ہر مذہب کی تعلیمات کا لازمی جزو رہی ہیں اس لئے تصوّف کی جلوہ گری ہر تہذیب و تمدّن میں کسی نہ کسی انداز اور کسی نہ کسی صورت میں کم و بیش ضرور ملتی ہے۔

چنانچہ اس دور میں بھی تصوّف نے روح عصر کی صورت اختیار کر لی تھی اور اس کا اثر جہاں زندگی کے دوسرے شعبوں پر پڑ رہا تھا اردو شعر و ادب پر پڑنا بھی لازمی اور یقینی تھا۔

یہاں یہ بات بھی تعطر ہیں رکھنا ضروری ہے۔ کہ تصوّف کا یہ اثر فارسی شاعری کے راستے پہلے ہی اردو شاعری میں داخل ہو چکا تھا غزل کیونکہ بنیادی طور پر واردات قلبی اور کیفیات عشق و محبت کے اظہار کی شاعری ہے۔ اس لئے تصوف کا اثر اس پر نسبتاً گہرا پڑا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ تصوّف اردو شاعری کا عموماً اور اردو غزل کا خصوصاً لازمی جزو بن گیا

یہ تھے وہ سیاسی اور سماجی حالات و واقعات جن کی روشنی میں غالب نے بڑے سوچ بچار اور خاصے ردو قبول کے بعد اپنے شعر و ادب کی راہیں متعین کیں مگر یہاں غور طلب بات یہ ہے۔ کہ یہ راہیں کیونکر متعین ہو سکیں ــــــ ؟ کس قدر تہذیبی اندوختہ سے کام لیا اور کس قدر نئی تہذیب سے تعلق وابستہ کیا۔ کون سی روائتیں قبول کیں کونسی رد اور کن روایتوں میں اضافہ کیا۔

غالب صنف غزل کے شاعر تھے اور ایک غزل گو شاعر کے لئے مسائل تصوّف سے خود کو الگ تھلگ رکھنا خصوصاً اس دور میں جس میں غالب تھے۔ قطعی ناممکن تھا ویسے بھی ایک فن کار کتنا ہی گریز کرے معاشرہ کی تہذیبی روایت کی جھلک فن پارہ میں ضرور ملتی ہے۔ غالب نے بھی اس تہذیبی روایت کا اظہار اپنی غزل میں ایسے موثر اور پرجوش انداز میں کیا ہے۔ کہ فلسفہ وحدۃ الوجود کے ساتھ ان کی جذباتی وابستگی جگہ جگہ نظر آتی ہے۔ اور ان پر ولی ہونے کا گمان گزرتا ہے۔ غالب نے بھی اپنے دلی

ہونے میں کیمیا گر کی طرح صرف ایک آنچ کی کسر بیان کی ہے۔ اور وہ کسر ان کی نگاہ میں بادہ خواری ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ تصوّف کے ساتھ غالب کا یہ قول محض تفنن طبع پر مبنی ہے۔ وہ نہ ولی تھے۔ اور نہ تصوف کو دل سے قبول کیا تھا وہ اس طرف ذہن کے راستے سے آئے تھے اور فکری حدود سے آگے نہ بڑھ سکے۔ ان کا تصوّف قوائے ذہن و عمل کو معطّل کرنے کا سبق نہیں دیتا۔ نہ وہ انسان کو عقل و شعور کی رفاقت ترک کرکے سینے کے چمن زار میں بیٹھے رہنے اور معرفت نفس حاصل کرنے کا درس دیتا ہے۔

غالب کی زندگی بھی عمل اور ردّ عمل کی گتھیاں سلجھانے میں بیتی حسرت گناہ بھی رہی اور حسرت تعمیر بھی۔ ان کا دل ہزاروں مادی خواہشوں اور سینکڑوں تمنّاؤں کا گہوارہ تھا۔ اور راہ کو پُرخار دیکھ کر کبھی مضمحل نہیں ہوا۔ پھر انہیں اپنی یکتائی کا بھی شدید احساس تھا۔

ان میں انسان دوستی ہمدردی اور حق پسندی کے جذبات تصوّف کے تعلق سے پیدا نہ ہوئے تھے۔ یہاں یہ بات بھی محل نظر ہے کہ غالب پر شیعی عقائد کا خاصا اثر تھا جس کے متعلق واضح اشارے ان کے شعر و ادب میں مل جاتے ہیں ان عقائد کی موجودگی میں بھی تصوّف کے ساتھ غالب کی قلبی وابستگی مشکل تھی۔ کیونکہ اصحاب تشیع کے نزدیک تصوّف کے ساتھ ان کے عقائد کی ہم آہنگی اور یک جہتی ممکن نہیں غالب نے تصوّف کو بلاشبہ محض شاعری کی حد تک لگا رکھا تھا۔ جس کی تصدیق غالب نے خود یہ لکھ کر کردی ہے۔ کہ

"تصوف برائے شعر گفتن خوب است"

یا ایک جگہ ــــ

"بھائی میرے پاس کیا رکھا ہے البتہ شعر گوئی کی خاطر تھوڑا سا تصوّف اور نجوم لگا رکھا ہے" اس سلسلہ میں ڈاکٹر خورشید الاسلام کی یہ رائے بڑی حد تک درست ہے کہ:۔

"ان کا تصوّف تزکیہ نفس یا دوسروں کی تلقین کے لئے کم ــــ اور اپنے تحفظ کے لئے زیادہ ہے۔"

اور یہ حقیقت ہے کہ غالب نے تصوف کو ایسے پر اثر واضح اور رنگین انداز میں پیش کیا ہے کہ یہ روح عصر ان کی داستانِ حیات کا سب سے زیادہ روشن باب نظر آتی ہے۔

غالب نے جس دور میں شاعری کی ابتدا کی صنفِ غزل موضوع اور مواد کے لحاظ سے بڑی محدود ہو چکی تھی اس میں نہ نیا پن باقی رہا تھا نہ تنوع۔ حسن و عشق، ہجر و فراق اور محبوب کے ناز و غمزے شاعروں کے مقبول ترین موضوعات تھے۔ اور ان موضوعات پر میرؔ سے لے کر ناسخؔ تک وہ سب کہا جا چکا تھا جو اس کے مزاج اور لب و لہجہ اور روایت کی مناسبت سے درست سمجھ لیا گیا تھا۔ اور اس وقت فنی کمال محض اس بات میں رہ گیا تھا۔ کہ ایک شاعر سابقہ مضمون کو نئے رنگ ڈھنگ اور نئی لفظی تراش خراش کے ساتھ سجا سنوار کر اپنے شعر میں اس طرح پیش کر دے ۔ کہ وہ پچھلی بندشوں سے سبقت لے جائے۔ اور اس طرح اردو کے کلاسیکی شعرا معین اور بندھے ٹکے اصولوں کے دائرے سے باہر قدم رکھنا پسند نہ کرتے تھے۔ غالب کی غزل کی ابتدا بھی اسی مروجہ طرز پر ہوئی۔ جو اس وقت کی روایت بن چکی تھی۔ حالانکہ غالب کی اردو غزل کی یہ روش اور حد بندی پسند نہ تھی۔

وہ غزل کی ساخت پرداخت میں انسان کی داخلی کیفیات کے ساتھ ساتھ سماجی تقاضوں اور ماحول کے اثرات کا خوشگوار رچاؤ بھی دیکھنا چاہتے تھے۔ مگر اس وقت عام ڈگر اور مخصوص راہ سے ایکا ایکی ہٹ کر کوئی نیا راستہ بنانا آسان نہ تھا۔ ذوقؔ اور مومنؔ بھی اسی معاشرہ کے پروردہ تھے۔ جس میں غالب سانس لے رہے تھے۔ لیکن وہ بھی کوئی نئی جہت اور نئی راہ غزل کی ادبی روایت سے ہٹ کر تلاش نہ کر سکے۔ اس کے لئے ایک خاص دل و دماغ اور ایک بڑے فنکار کی ضرورت تھی۔ اور یہ ضرورت صرف غالب ہی پوری کر سکتے تھے۔ جنہیں ان کے خالق نے خاص ذہنی افتاد کے ساتھ پیدا کیا تھا ! اور وہ صلاحیت ودیعت کر دی تھی۔ جس سے انسانی جذبات اور درد دل کی کیفیات کو بخوبی سمجھا اور پرکھا جا سکتا ہے۔

اس کے علاوہ غالب میں روش عام سے بچ کر چلنے اور اپنی دنیا الگ بنانے کا ایک فطری جذبہ بھی موجود تھا۔ اس جذبہ کا تقاضہ بھی یہی ہو سکتا تھا۔ کہ غزل کے

بے جان جسم میں نئی روح ڈالی جائے تاکہ اس میں معنویت کے ساتھ ساتھ انفرادیت پیدا ہو سکے۔

اسی لئے غالب نے اپنی شاعری کی ابتداء میں اردو غزل کے شاعروں کے بجائے بیدلؔ کو اپنا نمونہ بنایا اور انہیں "رنگ بہار ایجادیٔ بیدل پسند آیا" لیکن شروع شروع میں فارسی الفاظ اور تراکیب کی کثرت سے زبان میں ثقالت اور خیالات میں پیچیدگی پیدا ہو گئی اور وہ طرز بیدل جس میں شعر کہنا غالب خود بھی قیامت سمجھتے تھے دہلی کے ادبی حلقوں میں کسی طرح مقبول نہ ہو سکا بلکہ ان کی اردو شاعری کا مذاق اڑایا گیا۔ جس کا اثر غالب کی طبیعت اور خیالات پر پڑنا ضروری تھا۔ چنانچہ جلد ہی اس رنگ سخن کو غالب نے ترک کر دیا۔ اور وہ طرز ادا اختیار کر لی۔ جس کے سبب آگے چل کر ان کی غزل کے مزاج میں رنگینی، شوخی اور نزاکت کے ساتھ ساتھ ایک رکھ رکھاؤ اور سلیقہ پیدا ہو گیا اور اس کے زاویہ نگاہ میں قلب و نظر کی واردائیں اور اردگرد پھیلی ہوئی زندگی کی حقیقتیں آپس میں یوں مل جل گئیں کہ غم عشق، غم روزگار بن گیا۔ اور آپ بیتی نے کچھ ایسا روپ دھار لیا۔ کہ جگ بیتی کا گمان ہونے لگا۔

پھر پُر لطف بات یہ ہے کہ غالب نے صنف غزل کی ظاہری شکل و صورت ہیئت و ساخت اور فنی نزاکتوں کا بھی پورا احترام ملحوظ رکھا ہے۔ انہوں نے نہ کسی جدید صنف سخن کی طرح ڈالی اور نہ کوئی نیا موضوع اردو شاعری کو بخشا وہ اس کے بھی قائل ہے ہیں کہ غزل میں سحر انگیزی کی کیفیت کا ہونا نہایت ضروری ہے۔ اسی لئے وہ "مشاہدہ حق کی گفتگو" پر بھی "بادہ ساغر" کے رنگا رنگ پردے اس لئے ڈال دیتے ہیں کہ غزل میں رمزیت اور ایمائیت کی فضا پیدا ہو جائے کیونکہ اس فضا کے قیام سے ہی غزل کے انداز میں دلکشی۔ مزاج میں وسیع المشربی اور مخصوص واقعات اور محدود حالات میں ہمہ گیری پیدا ہو جاتی ہے جس کے سبب ہر صاحب نظر اپنی توفیق اور صلاحیت فکر کے مطابق نتیجے اخذ کرتا ہے۔ اور رائے دیتا ہے۔ اور ایسے کلام پر جتنی بار نظر ڈالی جائے ایک نیا کیف اور ایک نیا سرور حاصل ہوتا ہے۔

غالب نے اپنی شاعری میں تشبیہوں اور استعاروں کا استعمال بھی کیا ہے لیکن یہ استعمال غالب کے یہاں اس لئے ہوتا ہے۔ کہ معنی کے اظہار میں شگفتگی اور رعنائی

پیدا کی جائے۔ اس لئے نہیں کہ صرف انداز بیان کی نمائش مقصود ہو کیونکہ غالب شاعری کو قافیہ پیمائی نہیں بلکہ معنی آفرینی سمجھتے ہیں۔ پھر کمال یہ ہے۔ کہ غالب نے نادر اور منفرد تشبیہیں اور استعارے بڑی ہوشمندی سے خود وضع کئے ہیں اور ان کو بڑی خوبصورتی اور وضاحت سے اپنے شعر میں استعمال کیا ہے۔ جس سے ان کے انداز بیان میں نہ صرف تازگی اور انفرادیت پیدا ہو گئی ہے۔ بلکہ ہر لفظ "گنجینۂ معنی کا طلسم" بن کر رہ گیا ہے۔ اور بلاشبہ یہ غالب ہی تھے۔ جن کی مجتہدانہ بصیرت احساس کی شدت فکر کی گرمی اور تجربے کی متوازن آمیزش نے اردو غزل کے بے روح جسم میں ایسی زندگی پیدا کر دی کہ جدید غزل کے امکانات بھی روشن ہو گئے۔ اور تہذیبی سرمایہ کی روایت بھی باقی رہی۔

غالب کی شاعری کے سلسلے میں یہ بات بھی قدرے غور طلب ہے۔ کہ ان کی شاعری کی ابتداء اردو سے ضرور ہوئی جو معاشرہ کی زبان ہونے کی حیثیت سے اس وقت ایک خاص ادبی مقام حاصل کر چکی تھی۔ لیکن غالب نے کافی عرصہ تک اس ادبی روایت کو درخور اعتنا کیوں نہ سمجھا اور وہ اپنی فارسی شعر گوئی پر ایک مدت تک کیوں ناز کرتے رہے —— یہاں تک کہ ایک مرتبہ ذوق کو بھی یوں مخاطب کیا۔

فارسی بیں تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ
بگذر از مجموعہ اردو کہ بیرنگ من است
فارسی بیں تا بدانی کاندر اقلیم خیال
مانی وارژنگم و آن نسخہ ارژنگ من است

لیکن غالب کی اس فارسی پسندی کا جائزہ لیا جائے تو اس کے کئی وجوہ سامنے آتے ہیں ایک وجہ تو یہ تھی کہ جب غالب آگرہ سے ترک سکونت کرکے دِلّی آئے تو یہاں کئی نادرہ روزگار شخصیتوں کی صحبت اور رفاقت انہیں نصیب ہوئی جو فارسی زبان و بیان کے علائم و رموز کا کامل ادراک رکھتے تھے۔ جن میں مفتی صدر الدین آزردہ مولانا فضل الحق خیر آبادی۔ مولوی امام بخش صہبائی۔ مولوی عبداللہ خان علوی اور نواب مصطفےٰ خان شیفتہ سرفہرست ہیں۔ جن کا اثر غالب کی حساس طبیعت پر پڑنا لازمی

تھا۔ اور یہی وہ لوگ تھے جنہوں نے غالب کو شاعری میں ذوق نظر کے ساتھ ساتھ دقت نظر سے کام لینے پر مجبور کیا۔

دوسری صورت یہ تھی۔ کہ غالب کے زمانے تک فارسی تعلیم ضروری تھی۔ اور اس کے باوجود کہ مغلیہ سلطنت کے زوال پذیری کے آثار تیزی سے ظاہر ہوتے جارہے تھے۔ فارسی کو سرکاری زبان کی حیثیت تا حال حاصل تھی۔

تیسری بات یہ بھی تھی کہ غالب کو اپنے ترک اور ایرانی ہونے پر بے حد فخر تھا۔ اور جیسا کہ میں اوپر تحریر کرچکا ہوں ایسے لوگ فارسی زبان کو اپنا تہذیبی اور علمی ورثہ سمجھتے تھے۔ اور اس ورثہ کی نگہبانی اپنا فرض ——— پھر غالب کو زبان فارسی سے مناسبت خاص ویسے ہی تھی۔ اپنے متعلق خود لکھا ہے۔

"فارسی زبان سے لگاؤ اور شعر و سخن کا ذوق فطری وطبعی تھا" اس کے ساتھ ساتھ یہاں اس بات کو بھی نظر میں رکھنا ضروری ہے۔ کہ عبدالصمد کی تعلیم نے جو فارسی زبان کا جید عالم تھا غالب کی طبیعت پر گہرا اثر ڈالا تھا۔ اور وہ تھوڑے ہی عرصہ میں فارسی زبان کے رموز وخوامض سے کافی حد تک آشنا ہو گئے تھے۔ یہی اسباب و محرکات تھے۔ جن کی وجہ سے غالب نے پہلے پہل فارسی شاعری کی طرف بڑے شدومد کے ساتھ رجوع کیا۔ اور دعوت فکر و نظر کے لئے "نقش ہائے رنگے رنگ" سجا اور سنوار دیئے لیکن مغل حکومت کے زوال کے ساتھ ساتھ فارسی کی قدر و منزلت تیزی سے کم ہوتی گئی۔ ادھر اردو کی ادبی اور علمی حیثیت سماج میں روز بروز بڑھتی جارہی تھی۔ اس لئے غالب کی فارسی شاعری کی وہ قدر نہ ہوسکی جس کے وہ متمنی تھے۔ چنانچہ فارسی شاعری کی ناقدری کے شکوہ و شکایت کے ساتھ ہی غالب نے اردو شاعری کی طرف زیادہ توجہ دینا شروع کردی۔ اور رفتہ رفتہ اردو کے نہ صرف مزاج سے واقف ہوگئے۔ بلکہ اس کی سرشت واضح اور متعین کردی اور اب ان کا مجموعہ اردو " بے رنگ" نہ تھا۔ غالب کی شہرت کا باعث یہی۔ "مجموعہ اردو" ہی بنا۔

غالب نے غزل کے علاوہ دیگر اصناف سخن میں بھی طبع آزمائی کی ——— مثنویاں بھی لکھی ہیں۔ اور قصائد بھی ——— قصیدوں کا تعلق عام طور پر قدردان امراء

اور سلاطین سے رہا ہے۔ جن سے شعرا اپنی دماغی محنت اور ذہنی کاوش کا صلہ متاع و مرتبت کی صورت میں حاصل کرتے تھے۔

غالب کی نظر میں بھی نظیری۔ قدسی، عرفی۔ صائب اور ظہوری وغیرہ تھے۔ جنہوں نے اچھے قصائد لکھ کر سلاطین وقت اور امراء سے وقار اور خوشحال زندگی بسر کرنے کا اطمینان حاصل کیا تھا۔ ذوق کی قدر و منزلت بھی ان کے سامنے تھی۔

غالب خوددار سہی ۔ آخر انسان تھے۔ انہیں بھی اچھی زندگی گزارنے کی تمنّا اور روزی کی فکر تھی۔ اس لئے انہوں نے ادبی روایت اور اپنی ضروریات کی خاطر قصائد لکھے لیکن ان میں بھی غالب کی انفرادیت اور جدّت جگہ جگہ نظر آتی ہے قصائد میں غالب نے مدح ضرور کی ہے۔ لیکن بہت کم اور یہ اس لئے کہ غالب طبعاً خوشامد پسند نہ تھے۔ اور نہ انہیں مدحیہ اشعار کی وجہ سے خوشامد پسند سمجھنا درست ہو گا۔

انہوں نے ایک خط میں خود لکھا ہے ۔

"کیا کروں اپنا شیوہ ترک نہیں کیا جاتا۔ وہ روش ہندوستانی فارسی لکھنے والوں کی مجھے نہیں آتی کہ بالکل بھاٹوں کی طرح بکنا شروع کر دیں۔ میرے قصائد دیکھو۔ تشبیب کے شعر بہت پاؤگے اور مدح کے بہت کم ۔"

پھر اسی کے ساتھ جب وہ ایک ممدوح سے مایوس ہو جاتے تھے۔ تو چند الفاظ کے ردّو بدل کے بعد ایک ہی قصیدہ کو دوسرے کے نام روانہ کر دیتے تھے۔ اور اس پر کبھی شرمندہ نہیں ہوئے۔ جس سے ظاہر ہے کہ غالب نے اس ادبی روایت کی نمائندگی کی ہے۔ جس سے زندگی کے لئے پورا پورا فائدہ اٹھانا شرط اوّل تھی۔

غالب بلاشبہ نہ صرف ایک عظیم اور بے بدل شاعر ہیں بلکہ جدید ادب کا آغاز بھی ان کی شخصیت ہی سے ہوتا ہے۔ جہاں ان کی فکری تگ و تاز نے اردو شاعری میں ہمہ جہت اور ہمہ رنگ دلبستان سجائے ہیں وہاں ان کے باغ و بہار اور شگفتہ شاداب طبیعت نے اردو نثر کے چمنستان کو بھی بڑی حد تک آراستہ و پیراستہ کیا ہے۔ بغور دیکھا جائے۔ تو ان کی اعلیٰ صلاحیتوں کی جلوہ گری شاعری میں کم اور نثر میں زیادہ نظر آتی

ہے۔ اور ان کی شاعری باوجود ہزار کوششوں کے اس قدر سادہ و بے تکلف نہیں ہو سکی جس قدر ان کی نثر ہے۔

غالب کی یہ نثر خطوط نویسی کی شکل میں ہے۔ خطوط نویسی کو غالب کے دور تک انشاء کہا جاتا تھا۔ اور انشاء کا عمال سلطنت کے لئے بحیثیت فن سیکھنا ضروری تھا عہد مغلیہ میں انشاء پردازی کا کام ہندو منشیوں کے سپرد تھا۔ اور اس وقت ہماری نثر کے دو اسلوب مروّج تھے۔ جس کے بارے میں ڈاکٹر سید عابد حسین نے تحریر فرمایا ہے[1]

"ایک سادہ پُر زور حقیقت نگارانہ اسلوب تھا۔ جس میں مغلوں کی ابتدائی سپاہیانہ زندگی کی شان نظر آتی تھی۔ دوسرا جس کی ابتدا ابو الفضل نے کی تھی ایک پر تکلف مبالغہ آمیز اسلوب تھا۔ جس میں زندگی کے بڑھتے ہوئے تکلفات اور پیچیدگیوں کا رنگ جھلکتا تھا۔ ہندو منشیوں میں سے بعض ایک طرز کے پیرو تھے۔ بعض دوسرے کے چنانچہ چندر بھان سادہ اور مادھو رام مقفٰی اور مسجع رنگین عبارت لکھنے میں مشہور تھے"

۔ فارسی طرز نگارشی کے یہی دو اسلوب اردو نثر میں بھی سنہ ۱۸۰۱ء کے بعد سے اپنائے جا رہے تھے لیکن زور مقفٰی اور مسجع عبارت ہی پر دیا جاتا تھا۔ جس سے مطلب و مقصد کے اظہار کی حیثیت ثانوی رہ گئی تھی۔ ان دو اسالیب کی موجودگی میں غالب کو اپنے مزاج کی ہی مناسبت سے مادھو رام کی انشاء پسند آنا چاہیئے تھی۔

لیکن خطوط غالب کی سادگی اور برجستگی کو دیکھ کر بعض وقت یہ سوال ذہن میں ابھرتا ہے۔ کہ وہ غالب جو طبعاً مشکل پسندی اور رنگین طرز تحریر کے دلدادہ تھے۔ اردو نثر میں کس طرح ایک سادہ و پُر وقار راہ نکالنے میں کامیاب ہو گئے۔ جس کا جواب یہی ہو سکتا ہے۔ کہ غالب کی چشم بینا زمانے کی روش اور وقت کی رفتار کو بغور دیکھ رہی تھی۔ اور اس وقت کا تقاضہ یہی تھا۔ کہ تضنع اور تکلف کی عام روایت سے ہٹ کر اردو نثر کے لئے ایسا سادہ اور حقیقت نگارانہ اسلوب اختیار کیا جائے۔ جو معاشرہ کی زندگی سے ہم آہنگ بھی ہو۔ اور اس میں ہر طرح کے خیالات و جذبات کو سلیس و عام فہم اردو میں ادا بھی کیا جا سکے۔ اور یہ اہم کام سب سے پہلے غالب نے اردو نثر میں انجام دیا۔

---

[1] قومی تہذیب کا مسئلہ تصنیف ڈاکٹر سید عابد حسین مطبوعہ انجمن ترقی اردو ہند علیگڑھ

اوپر کے جائزے سے ان سیاسی اور تہذیبی عوامل اور اس ادبی مذاق کی کسی قدر نشاندہی ہوجاتی ہے جس سے غالب سب سے پہلے متاثر ہوئے۔ اور اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر حالات اور مزاج کے مطابق شعر و ادب میں جدید فکری سانچے ڈھالے مگر یہ بات ابھی غور طلب ہے۔ کہ غالب اس تہذیب سے کس حد تک متاثر ہوتے جو انگریزوں کی سرپرستی میں ۱۸۰۳ء کے بعد آہستہ آہستہ دہلی کی زندگی میں راہ پا تی جارہی تھی۔

بعض محققین کا خیال ہے۔ کہ غالب جدید طرز تہذیب سے ۱۸۵۷ء کے بعد ہی متاثر ہوئے جب اس کے واضح نقوش معاشرے کی زندگی میں ابھرے اور اس وقت غالب کیا عام طبقہ ہی متاثر ہوا۔ اس طرح جدید تہذیب سے متاثر ہونے میں غالب کی روشن ضمیری اور وسیع النظری کا کوئی دخل نہیں اور وہ وقت ایسا تھا۔ جب غالب اپنی زندگی کے آخری دور سے گزر رہے تھے۔ اس دور میں ویسے بھی انسان کے قوائے ذہن و عمل مضمحل ہوجاتے ہیں اور اس میں وہ عزم و حوصلہ باقی نہیں رہتا کہ نئے تہذیبی تقاضوں کی روشنی میں جذبہ و فکر کے جدید رنگ محل تعمیر کرسکے۔ اور غالب بھی باوجود جدت پسند ہونے کی اسی وجہ سے حال اور مستقبل میں کوئی تعلق پیدا نہ کرسکے اور "دل میں حسرت تعمیر لئے اس دنیا سے رخصت ہوگئے۔"[۲]

میرے خیال میں اس قسم کی رائے وہی ناقدین دے سکتے ہیں جو کسی فنکار کی زندگی اور تخلیقات کو ژرف نگاہی اور باریک بینی سے دیکھنے اور پرکھنے کے قائل نہیں ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ غالب کے شعر و ادب میں دونوں تہذیبوں کے ٹکراؤ سے جو گونج پیدا ہوئی ہے۔ اس کی آواز صاف سنائی دیتی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ یہ آواز کشمکش اور تضاد کی صورت میں کسی حد تک ملتی ہے۔ جس کا تذکرہ غالب نے خود بھی اس انداز سے کیا ہے ؎

ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ میرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے!

؎

اور اس کی بڑی وجہ یہ ہے۔ کہ اس وقت جدید تہذیب کے کچھ نقوش ابھر

---

۲ غالب جاگیرداری نظام کا مرثیہ خواں ، مصنفہ اے۔ بی اشرف غالب نمبر۔ ادب لطیف لاہور ۱۹۷۰ء

رہے تھے اور کچھ ابھرنا باقی تھے معاشرے کی جب ایسی کیفیت ہو تو کسی فنکار سے یہ توقع رکھنا کہ وہ اپنی تخلیقات میں قطعی رائے دے دے کسی طرح مناسب نہیں ویسے بھی یہ کام فلسفی کا ہے۔ جو اپنے نظریات کی خاطر ایک جامع نظامِ فکر ترتیب دیتا ہے اور حقائق کا اظہار انتہائی ربط و تنظیم کے ساتھ کرتا ہے۔ جس میں آئندہ ردو بدل کی گنجائش کم ہی ہوتی ہے۔

برخلاف اس کے ایک فنکار معاشرے کے تقاضوں کو جس انداز سے محسوس کرتا ہے اس کی عکاسی اپنی تخلیقات میں نت نئی دلفریبیوں کے ساتھ کر دیتا ہے۔ لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کہ زندگی متحرک شے ہے۔ بدلتی رہتی ہے۔ اور اس کے تقاضے تجربات و انکشافات اور حالات واقعات کی روشنی میں کچھ سے کچھ ہو جاتے ہیں اس لئے کسی فنکار کی تخلیقات میں یک رنگی اور یک آہنگی کی جستجو بیکار ہے۔ غالب بھی ایک عظیم فنکار ہیں انہوں نے اپنی فکر و نظر کے جو چراغ روشن کئے ہیں۔ وہ زندگی کی گوناگوں پیچیدگیوں مظاہر فطرت کی بیشمار رنگینیوں اور دل کی لاتعداد کیفیتوں کو سمجھنے اور پرکھنے کے بعد جلائے ہیں اور جب بھی معاشرے کے تقاضوں میں پھیلاؤ اور تجربات کے نتیجے میں کوئی تبدیلی رونما ہوتی ہے۔ پرانے چراغوں کو بجھانے اور نئے روشن کرنے میں کبھی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی چنانچہ طبیعت کی اسی روادار روش کے مطابق جب انہوں نے تفکر اور تمدن کے وہ سانچے جو مشرقی تہذیب نے قائم کر رکھے تھے صنعتی انقلاب کی بدولت ٹوٹتے دیکھے۔ تو سرسید احمد خان کو بھی یہ کہہ دیا۔

مردہ پروردن مبارک کار نیست

بہر حال غالب نئی تہذیب سے اس وقت روشناس ہوئے جب وہ بحالی پنشن کی خاطر ۱۸۲۸ء میں کلکتہ پہنچے۔ کلکتہ اس وقت ہندوستان کا پایۂ تخت تھا نادرہ روزگار لوگ اصحاب فن اور گلکرسٹ جیسے فارسی دان انگریز وہاں موجود تھے۔ دریائے گنگا میں دخانی کشتیوں کا سفر اسی سال شروع ہو گیا تھا۔ دوکانوں میں ہندوستانی اور یورپی اشیاء برائے فروخت موجود تھیں۔ بازار پُررونق تھے جن کی چہل پہل میں مغربی حسیناؤں کی وجہ سے اور بھی اضافہ ہو جاتا تھا۔

کاغذ تیار کرنے کا کارخانہ اور اردو پریس قائم ہو چکا تھا۔ اخبارات نکل رہے تھے

جن سے لوگوں کی معلومات میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا۔ اور یہ معلومات قدیم رسم ورواج کی گرفت ڈھیلی کرنے کی کا سبب بن رہی تھی۔ راجہ رام موہن رائے کے اخبار" جام جہاں نما" سے نئی سماجی تحریک کا آغاز ہو گیا تھا۔ بلکہ اس وقت یہ تحریک شباب پر تھی۔ یہ تحریک انگریز کی اس پالیسی کے خلاف تھی جس کے تحت وہ ہندوستان کے لوگوں کو صرف مشرقی تعلیم دلانا چاہتا تھا۔ اسی لئے اس نے فورٹ ولیم کالج میں اردو نثر نگاری کا شعبہ قائم کرکے مختلف زبانوں کی کئی کتابوں کا اردو ترجمہ کرایا تھا لیکن راجہ رام موہن ہندوستانیوں کیلئے مغربی طرز تعلیم کو بھی ضروری سمجھ رہے تھے اور چنانچہ غالب نے کلکتہ کے قیام میں پرانی تہذیب کے ساتھ ساتھ اس تہذیب کو بھی دیکھا جو برق و بخارات اور ایجادات و انکشافات کی تہذیب تھی۔

غالب کا قیام کلکتہ میں ڈیڑھ سال سے زائد رہا۔ اور یہ مدت غالب جیسے ذہین اور حقیقت پسند شخص کے لئے کافی تھی۔ کہ وہ دونوں تہذیبوں کی خوبیوں اور خامیوں کو یکجا دیکھنے کے بعد اپنے نظریات قائم کرسکے۔ اور بلاشبہ غالب اس ذہنی بیداری سے بے حد متاثر ہوئے۔ جو انہوں نے مغربی تہذیب کے اثر سے کلکتہ میں پائی۔

غالب کی نئی تہذیب کا زیادہ اثر قبول کرنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی۔ کہ وہ بچپن ہی سے انگریزوں کے طور طریق سے کسی حد تک واقف تھے۔ اور انہیں پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ جب کہ دوسرے لوگ انہیں اچھا نہ سمجھتے تھے۔ دوسرے غالب مذہب کے ظاہری رسم ورواج کے کبھی پابند نہیں رہے۔ اس لئے ملکی اور مذہبی تعصب بھی ان کے دل میں جگہ نہ پاسکا۔ جس کے سبب وہ کلکتہ میں انگریزوں کی برتری اور مغربی تہذیب کی اقدار کے اور بھی قائل ہو گئے۔ اسی احساس کی کارفرمائی اس وقت نظر آتی ہے۔ جب غالب نے " آئین اکبری " کی تالیف پر ۱۸۵۶ء میں تقریظ لکھی اور سابقہ نظام کو موجودہ نظام سلطنت کے مقابلے میں ہیچ گردانا۔ اور انگریزوں کے آئین کو تمام پرانے آئین سے بہتر بتایا۔

ظاہر ہے یہ تقریظ سرسید کو کس طرح پسند آسکتی تھی۔ غالب کو لوٹا دی اور ایک عرصہ تک دونوں میں رنجش رہی۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے۔ کہ غدر کے بعد سرسید کو عملاً اسی راہ پر گامزن ہونا پڑا۔ جو غالب اپنی تخلیقات میں بہت پہلے اختیار

کر چکے تھے۔

دلّی میں بھی نئی تہذیب کے اثرات غدر سے کافی پہلے ظاہر ہو چکے تھے ۱۸۳۶ء میں اردو پریس قائم ہو گیا تھا اور مولوی محمد باقر نے ایک ہفت روزہ "اردو اخبار" کے نام سے جاری کر دیا تھا۔ جو ۱۸۵۷ء تک باقاعدگی کے ساتھ شائع ہوتا رہا۔ اس کے علاوہ بھی کئی اردو اخباروں کی اشاعت شروع ہو گئی تھی۔ جس کے سبب لوگ نئی تہذیب سے آشنا ہو رہے تھے۔

دہلی کالج میں بھی طلباء کی تعداد روز بروز بڑھ رہی تھی۔ یہی وہ کالج تھا جس میں فارسی استاد کی ضرورت پیش آئی تو انگریز حکام کی نظر سب سے پہلے غالب پر پھر مومن اور صہبائی پر پڑی —— غالب نے یہ نوکری اپنی عزت کی خاطر نہ کی مومن سو روپیہ سے کم پر رضامند نہ ہوئے لیکن صہبائی چالیس روپیہ ماہانہ پر رضامند ہو گئے۔ جو بعد میں پچاس روپیہ ہو گئی۔

انگریزی طریقہ علاج کی طرف بھی لوگ رجوع ہو رہے تھے۔ اور غالب ان تبدیلیوں کے درمیان کھڑے ان تقاضوں کو سمجھ رہے تھے، جو مستقبل ادب سے کر سکتا تھا اور انہیں تقاضوں کی خاطر غالب نے اپنے شعر و ادب میں قدیم و جدید کو ایک دوسرے کی روشنی اور روشنی میں دیکھنے اور پرکھنے کی روایت قائم کی اور ایسی راہ اختیار کی جس سے قدیم کا اعتبار بھی قائم رہا اور جدید کا وقار بھی —— لیکن اس وقت اس نئی راہ کی پوری اہمیت اور دور رس نتائج کا صحیح اندازہ بہت ہی کم لوگوں کو ہو سکا جس کا احساس غالب کو تھا۔ لیکن یہ حسرت کبھی نہ رہی کہ وہ اپنے شعر و ادب میں وہ سب کچھ نہ کر سکے جو چاہتے تھے۔

انہوں نے اردو نثر میں ایسا طریقہ ایجاد کر دیا تھا۔ جس نے مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا اور فن شعر میں وہ طرز ادا اختیار کی جس سے ان کے اشعار "گنجینۂ معنی کا طلسم" بن گئے۔ انہیں اپنی اس روش پر خود بھی بڑا ناز تھا —— جس کا اظہار انہوں نے اس طرح کیا ہے ؎

گر شعر و سخن بدہر آئین بودے
دیوان مرا شہرت پروین بودے

غالب گر ایں فن وسخن دیں بودے   آں دین را ایزدی کتاب ایں بودے

غالب کی اس بات کے معترف نواب غلام مصطفےٰ خان شیفتہ بھی تھے۔

اے حسرتی مپرس ز غالب کہ در سخن
آں کار می کند کہ یہ افسون نکردہ کس

غالب کو افسوس رہا تو بس یہ کہ ان کی پوری قدر اپنے دور میں نہ ہو سکی اور حسرت رہی تو یہ کہ وہ اپنی خواہشات کے مطابق رنگ محل تعمیر نہ کر سکے۔ جس میں وہ پرسکون زندگی گزار سکے۔ اور یہی حسرتِ تعمیر دل میں لئے اس دنیا سے رخصت ہو گئے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ جو راہ غالب نے اپنے شعر و ادب میں اختیار کی تھی۔ اب بھی اس پر کئی کاروان فکر گامزن ہیں اور اسے غالب کی روشن ضمیری اور وسیع النظری کا فیضان نہ کہا جائے۔ تو اور کیا کہا جائے۔؟

جہانِ غالب[1]

غالب کی شخصیت اور شعر و ادب پر کئی زاویوں سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور کئی پہلو اجاگر بھی ہوئے ہیں۔ لیکن ابھی بہت سے گوشے اجاگر ہونا باقی ہیں۔ جس کے لئے بصیرت افروز ذہنی کاوش، گہرے مطالعہ اور تحقیق کی ضرورت ہے۔ "جہانِ غالب" بھی کوثر چاندپوری کے گہرے ادبی مطالعہ اور عملی بصیرت کی ایک حسین کوشش ہے۔ جس سے غالب کی زندگی کے کئی گوشے سامنے آئے ہیں اور ان کی شاعری کے مختلف پہلوؤں پر بحث کی گئی ہے۔

کوثر چاندپوری کی شخصیت اردو ادب میں جانی پہچانی ہے۔ وہ ایک عرصہ سے اس کی بے لوث اور پر خلوص خدمت کبھی اہلِ قلم اور کبھی اہلِ نظر کی حیثیت سے کر رہے ہیں۔ انہوں نے کئی ناول اور افسانے بھی لکھے ہیں۔ اور علمی مضامین بھی لیکن وہ علمی موضوعات پر کافی معلومات اور تحقیق کے بعد نہایت موثر اور شگفتہ انداز میں قلم اٹھاتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ علمی اور ادبی تخلیقات میں کئی خصوصیات یکساں ہوتی ہیں۔ مگر ایک فرق جسے میں اہم سمجھتا ہوں یہ ہے۔ کہ ایک میں صرف رائے دی جاسکتی ہے۔ اور ایک میں رائے کے ساتھ ساتھ اگر ممکن ہو تو فیصلہ بھی

---

[1] غالب کی فکر و فن پر کوثر چاندپوری کی کتاب

کیونکہ علمی موضوعات کی تحقیق و تفتیش کا سلسلہ کسی ایک تحریر یا کسی ایک ادبی کوشش پر ختم نہیں ہو جاتا۔ بعض اوقات تو شروع ہوتا ہے۔ اور کبھی کبھی اہلِ علم کی فکری جولانگاہ بن جاتا ہے۔ جسے ہر اہلِ نظر چھان پھٹک کے بعد اپنی رائے کے ساتھ قارئین کے سامنے پیش کر دیتا ہے۔

یہ رائے دیگر اہلِ نظر سے ہم آہنگ بھی ہو سکتی ہے۔ اور مختلف بھی۔ کبھی کبھی کچھ موافق اور کچھ مخالف ـــــ مگر یہ ضروری ہے۔ کہ یہ رائے خلوص اور دیانت پر مبنی ہو ـــــ عقیدت یا مخالفت کے جذبہ سے پاک و صاف ہو۔ صحیح و درست واقعات اور خصوصیات کی نشاندہی کرتی ہو ـــــ۔ جہانِ غالب " غالب کی زندگی اور اس کے فن و شعر پر کوثر چاند پوری کا ایک معلوماتی اور تحقیقی جائزہ ہے مگر اس کے مطالعہ کے بعد میں نے کہیں کہیں یہ بھی محسوس کیا ہے۔ کہ صاحبِ تصنیف نے رائے کے بجائے فیصلے صادر کر دیئے ہیں۔ جن کی اساس قیاس آرائی پر زیادہ ہے اور حقیقت پر کم۔

حالانکہ علمی مباحثہ میں قیاس آرائی کی گنجائش کم ہی ہوتی ہے۔ چنانچہ "جہان" کے وہ مقامات جہاں میں نے صاحبِ تصنیف کے فیصلہ سے خود کو متفق نہیں پایا۔ ان کی نشاندہی اس مضمون میں کرنا غالب کو پہچاننے کے لئے ضروری سمجھا ہے۔ لیکن اس سے میرا دعویٰ یہ ہرگز نہیں کہ جو کچھ میں نے سوچا اور سمجھا ہے وہ بالکل درست ہے۔ بہت ممکن ہے۔ یہ میرے علم و نظر کی فرومائیگی ہو مگر یہ رائے پڑھنے پڑھانے والے ہی دے سکیں گے۔

ایک جگہ صاحبِ تصنیف نے غالب کے ماحول اور ان کی زندگی پر اظہارِ رائے فرماتے ہوئے تحریر فرمایا ہے [۱]

" ان میں جہد و عمل کی زیادہ صلاحیت نہ تھی۔ وہ شعر ہی کو ذریعہ معاش بنائے ہوئے تھے۔ اور سخت کوشی سے گھبراتے تھے۔ زندگی کی دوڑ میں حصہ لئے بغیر اس کی رگوں سے وہ رس اور مٹھاس نچوڑ لینا چاہتے تھے۔ جس کے لئے بڑی

---

[۱] صفحہ ۲۴ ـــــ ۲۵ جہانِ غالب

قوتِ عمل اور محنت درکار ہوا کرتی ہے۔ جب یہ مٹھاس اُن کے حصہ میں نہ آتی تھی تو بڑی گھٹن اور تکلیف محسوس کرتے تھے۔ کڑھنے اور جلنے کا یہ رجحان ہمیشہ ہی ان کے اندر رہا ——۔

اس عبارت سے صاحب تصنیف کا اگر یہ مقصد ہے تو بڑی حد تک درست ہے۔ کہ غالب نہ ملازمت کی خاطر دربدر مارے پھرے ماسوائے ایک کوشش کے۔ نہ کوئی کاروبار کیا۔ نہ کوئی دوکان لگائی نہ کوئی کارخانہ کھولا۔ اور نہ پیشۂ آباء اختیار کیا۔ جس کی آمدنی سے ان کا اور ان کے متعلقین کا گزربسر ہو سکتا۔ لیکن یہ حقیقت بھی نظر انداز نہیں کی جا سکتی کہ وہ عزت اور نیک نامی جو شاعری کی بدولت غالب اور ان کے خاندان کو حاصل ہوئی۔ وہ شاید کسی پیشہ یا کاروبار سے کبھی حاصل نہ ہو پاتی۔ پھر یہ بات بھی درست نہیں معلوم ہوتی کہ غالب میں جہد وعمل کی زیادہ صلاحیت نہ تھی۔

غالب نے اپنے جائز حقوق اور درست مطالبات کی بحالی کے لئے اپنی پوری صلاحیت سے تمام عمر جدوجہد کی اور کوئی دقیقہ اٹھانہ رکھا۔ بحالیٔ پنشن کے لئے دور دراز کا سفر بھی اختیار کیا اور کئی سال گھر سے باہر بھی رہے جبکہ اس زمانہ میں سفر کرنا آج کی طرح نہ آسان تھا اور نہ آرام دہ —— ویسے بھی سفر میں انسان کو گھر جیسا کبھی آرام نہ ملتا ہے۔ اور نہ سکون۔ قلعہ دہلی سے تعلق اور دربار رام پور سے وابستگی بھی انُ کی جدوجہد اور قابلیت کا ہی نتیجہ تھی۔

وہ پے در پے ناکامیوں اور نامرادیوں سے دل برداشتہ ضرور ہوتے ہیں لیکن سراپا غم نہیں بن جاتے۔ فکرِ فردا بھی دامن گیر رہتی ہے۔ بلکہ نئے حالات کے مطابق خود کو ڈھالنے کی کوشش کرتے ہیں یہ کوشش کس قدر کامیاب ہوتی ہے اور کس قدر ناکام —— یہ علیحدہ بات ہے۔ کیونکہ اس میں عمل وحرکت کے ساتھ ساتھ اسباب وعوامل کا بھی دخل ہوتا ہے۔ جن کا سازگار ہونا ہر شخص کے اپنے بس کی بات نہیں۔

غالب نے کبھی کسی شخص کو دھوکہ دے کر یا ناجائز طور پر زبردستی کسی شخص

سے کوئی رقم بھی حاصل نہیں کی۔ جس کی وجہ سے غالب پر زندگی کی دوڑ میں حصہ لئے بغیر اس کی رگوں سے رس اور مٹھاس نچوڑ لینے کا الزام عائد کیا جا سکے۔ یہ فیصلہ بھی درست نہیں معلوم ہوتا۔ کہ غالب حاسد تھے جلنے اور کھڑکنے کا رجحان ہمیشہ ان کے اندر رہا۔

یہاں تک کہ؎

"عوام کی نشاط و کامرانی سے بھی کوفت ہوتی تھی۔ اور خواص کی سربلندی سے بھی ——"

غالب کی زندگی کو نظر میں رکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ نہایت دوست نواز، ہمدرد اور خوش مزاج شخص تھے۔ انسان دوستی ان کا ایمان تھا۔ وہ بلا امتیاز رنگ و نسل اور قوم و مذہب اپنے دوستوں اور شاگردوں سے بڑی محبت اور فراخدلی سے ملتے تھے۔ ایک حاسد شخص نہ کبھی خوش مزاج ہو سکتا ہے۔ نہ خوش طبع —— یہ اس کے مزاج میں شگفتگی پیدا ہو سکتی ہے۔ اور نہ خیالات میں بلندی۔

ہاں —— اگر یہ اعتراض کیا جاتا کہ غالب میں احساس برتری زیادہ تھا تو یہ اعتراض بڑی حد تک درست ہوتا۔

اس میں شک نہیں کہ غالب دیگر شعراء کو کم ہی خاطر میں لاتے تھے۔ خصوصاً اردو شعراء میں صرف میرؔ کو ہی استاد سمجھتے تھے۔ ذوقؔ کو انہوں نے کبھی اچھا شاعر نہ سمجھا' مومن کو بھی صرف اپنی وضع کا اچھا کہنے والا تسلیم کیا ہے۔

ایک جگہ صاحب تصنیف نے غالب کے دوران قید ان کے دوستوں رشتہ داروں اور اہل دہلی کی لاتعلقی اور بائیکاٹ کا سبب نواب شمس الدین احمد خاں کے واقعہ پھانسی اور غالب کی انگریز دوستی کو قرار دیا ہے۔ لکھتے ہیں؎۲

؎۱ صفحہ نمبر ۲۵ جہان غالب ؎۲ صفحہ نمبر ۵۵ جہان غالب

"عام طور پر جذبات اتنے مشتعل تھے کہ زمانہ قید میں غالب کا کوئی دوست یا عزیز داب مصطفےٰ خان شیفتہ کے علاوہ اُن سے ملنے نہیں گیا .... اس واقعہ کے ٹھیک دس سال بعد جنگ آزادی کی آگ بھڑک اٹھی تھی۔ عوام کے دلوں میں انگریزوں سے نفرت کا جذبہ اندر ہی اندر پنپ رہا تھا۔ اور جو ہندوستانی ان سے اتنا میل جول رکھتے تھے۔ کہ اس کے نتیجہ میں کسی اور ہندوستانی کو جانی یا مالی نقصان پہنچے وہ ضرور عوام کی نفرت کا نشانہ بن جاتے تھے۔ جیسا کہ غالب کے بائیکاٹ سے ظاہر ہے"

مذکورہ بالا تحریر سے یہ نتیجہ نکلتا ہے۔ کہ غالب سے ان کے دوست اور اقربا ناراض تھے۔ اسی لئے قید میں اُن سے بے اعتنائی برتی گئی اول تو یہ کہ غالب کی قید کا واقعہ ۱۷ر جولائی ۱۸۴۷ء کو اور نواب شمس الدین خان کی پھانسی کا سانحہ اکتوبر ۱۸۳۵ء کو وقوع پذیر ہوا۔ یعنی واقعہ قید سے بارہ سال قبل ـــــ اگر اعزاء اور احباب اس واقعہ کی بناء پر غالب سے ناراض ہوتے تو واقعہ پھانسی کے بعد سے غالب کے قید ہونے تک کے طویل عرصہ میں بھی وہ ان کا مستقل بائیکاٹ رکھتے مگر ایسا کوئی ثبوت نہیں ملتا اور نہ ایسا ہوا ہے۔ یہ ممکن ہے غالب کے دوست اور اعزاء اپنی خاندانی وجاہت اور چند مصلحتوں کی بناء پر اُن سے قید میں ملنا مناسب نہ سمجھتے ہوں جیسا کہ آج بھی کسی سزا یافتہ کو شرفاء اور اُمراء اپنا دوست یا رشتہ دار ظاہر کرنا باعث ننگ وعار سمجھتے ہیں۔ خود غالب کی طبیعت پر بھی اس واقعہ اسیری نے رنج وغم اور بے عزتی کا گہرا تاثر چھوڑا تھا۔ جس کا اظہار جگہ جگہ ان کے شعر و ادب میں موجود ہے۔ مثلاً ؎

گرچہ توقع گرفتاری جاویدم نیست
لیکن از دہر دگر خوشش دلی امیدم نیست

———

راز دانا غم رسوائی جاوید بلا ست
بہر آزار غم از قید فرنگم نبوَد!

منم آئینہ واین حادثہ زنگ است دلے
تاب بدنامی آلائش زنگم نبود !

ؔ

غالب کا حبس بھی ان کے اضطراب، بے چینی، بے بسی اور بے کسی کی منہ بولتی تصویر ہے ان کی ایک تحریر سے بھی پتہ چلتا ہے۔ کہ یہ واقعہ قید اُن کے لئے کس قدر باعث تکلیف و بے عزتی تھا۔ اور اسی ذلت خیزی کی وجہ سے وہ ہندوستان کو بھی چھوڑ دینے کے خواہش مند تھے۔

لکھتے ہیں ــــــ

"میری یہ آرزو ہے کہ اب دنیا میں نہ رہوں اور اگر رہوں تو ہندوستان نہ رہوں۔ مصر ہے۔ ایران ہے۔ بغداد ہے یہ بھی جانے دو خود کعبہ آزادوں کی جائے پناہ اور آستانہ رحمۃ اللعالمین دلدادوں کی تکیہ گاہ ہے۔ دیکھئے وہ وقت کب آئے گا۔ کہ درماندگی کی قید سے جو اس گزری ہوئی قید سے زیادہ جانفرسا ہے۔ نجات پاؤں اور بغیر اس کے کوئی منزل مقصود قرار دوں سر بصحرا نکل جاؤں لے"

بایں ہمہ ان کے دوست احباب غالب کی ضروریات کو پورا کرنے اور ان کو رہا کرانے کے دلی خواہشمند رہے ہیں دوم اس "بائیکاٹ" کی وجہ نواب شمس الدین احمد خان کا واقعہ پھانسی بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ کیونکہ غالب کے بہت سے اعزا بھی نواب شمس الدین خان سے اس لئے رنجش رکھتے تھے کہ انھوں نے اپنے سوتیلے برادران نواب امین الدین احمد خان اور نواب ضیا الدین احمد خان کی جاگیر لوہارو جس کے بارے میں وہ اپنے والد نواب احمد بخش خان کو ان کی زندگی میں دستبرداری نامہ دے چکے تھے۔ غضب کرنے کی سعی کی تھی۔

علاوہ ازیں شمس الدین احمد خان نواب احمد بخش خان کی میواتی النسل بیوی

لے یادگار غالب صفحہ ۲۷ — ۲۸

کے بطن سے تھے۔ اور دیگر دو صاحبزدگان ان کے اپنے خاندان کی بیگم کے بطن سے ۔ اس لئے غالب کے خاندان کے افراد نواب شمس الدین احمد خان کو اپنے برابر یا ہم پلہ بھی نہ سمجھتے تھے۔ پھر اسی لوہارو کی جائیداد کے دعوے کا نتیجہ فریزر کے قتل اور شمس الدین کی پھانسی کی شکل میں نمودار ہوا ۔ اس واقعہ پھانسی کی بناء پر غالب کے اعزاء کا دوران قید غالب کا بائیکاٹ کرنا سمجھ میں نہیں آتا۔ اہل دہلی کی ناراضگی کی کوئی وجہ اور طویل مقاطعہ کی گنجائش بھی نظر نہیں آتی۔ خود بہادر شاہ ظفر تاجدار دہلی نے غالب کی سفارش ان کے مقدمہ میں کی تھی۔ قطع نظر اس کے کہ اس وقت اس سفارش کا وزن کیا تھا اور اس کا اثر کیا ہوا۔ مگر اس سے اس ہمدردی اور محبت کی نشاندہی ضرور ہو جاتی ہے۔ جو اہل دہلی کو غالب کے ساتھ تھی۔

غدر کے زمانے میں بھی کسی شخص نے غالب کے خلاف مخبری نہیں کی ورنہ کوئی شخص بھی اس پرآشوب زمانے اور ہنگامی دور میں سابقہ رنجش کی وجہ سے غالب کے خلاف کوئی غلط بات کہہ دیتا تو بلا تحقیق غالب کی طلبی انگریز حکام کے روبرو ہو جاتی۔ اور پھر نا معلوم کیا ہوتا۔ کیونکہ بہت سے بے گناہ مخبروں کی غلط بیانیوں سے ہی تختہ دار تک پہنچ گئے۔ اور پھر نہ لوٹ سکے۔ اگر کچھ نہ بھی ہوتا پھر بھی غالب کو اپنی بیگناہی ثابت کرنے کیلئے بڑی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا۔ چنانچہ ایک خط میں خود تحریر کرتے ہیں

"مگر چونکہ میری طرف بادشاہی دفتر میں سے یا مخبروں کے ہاں سے کوئی بات نہیں پائی گئی۔ لہٰذا طلبی نہیں ہوئی ورنہ جہاں بڑے بڑے جاگیردار بلائے گئے۔ (مثلاً لوہارو والے) یا پکڑے ہوئے (مثلاً جھجھر۔ بلب گڑھ۔ بہادر گڑھ۔ فرخ نگر والے) آئے میری کیا حقیقت ہے۔"

یہاں غالب کے خلاف بہادر شاہ کے سکے کہنے کی مخبری کا حوالہ دیا جا سکتا ہے جس کی پاداش میں نہ صرف غالب کی خاندانی پنشن بند ہوئی بلکہ خلعت اور درباری اعزاز بھی منسوخ ہو گیا تھا۔ مگر یہ مخبری کسی سابقہ رنجش کا نہ ماحصل تھی اور نہ کسی منظم سازش اور نفرت کا نتیجہ، جو برسوں سے ذہنوں میں پرورش پا رہی ہو۔

یہ محض شک وشبہ کی پیداوار تھی جب بدگمانیاں ختم ہوگئیں شک وشبہ کا دور بھی نہ رہا غالب کی منسوخ شدہ پنشن بھی جاری ہوگئی اور خلعت بھی بحال ہوگیا۔

اس واقعہ اسیری کے سلسلہ میں صاحب تصنیف نے خود بھی یہ تسلیم کیا ہے کہ غالب کے دل و دماغ پر اس کا بہت زیادہ اثر تھا اور اس ذلت خیزی کے بعد وہ نہیں چاہتے تھے کہ زندہ رہیں اگر زندہ ہی رہنا ہے تو ہندوستان کے علاوہ روم، مصر، ایران یا کعبہ چلے جائیں۔ غالب کی اسی آرزو پر صاحب تصنیف نے یہ نتیجہ برآمد فرمایا ہے۔ ل

" لیکن ان ممالک میں بھی تو سوسائٹی کے کچھ قوانین ہوں گے اور ان کی پابندی ناگزیر ہوگی اور کعبہ تو ایسی جگہ ہے جہاں شراب نوشی پر بھی شدید پابندیاں عائد رہی ہیں۔ سوسائٹی تو الگ رہی گھر کی چہار دیواری میں بھی غالب کو اس آزادہ روی کی سماجی سزا ملتی تھی چنانچہ ان کی بیوی نے کھانے کے برتن علیحدہ کر دیئے تھے۔"

میری ناقص رائے میں غالب نے کسی دیگر ملک جانے کی خواہش محض جوا کھیلنے اور شراب نوشی کے لئے نہیں کی تھی جس کی وجہ سے یہ کہا جاسکے کہ وہاں بھی غالب کی یہ برائیاں جاری نہ رہ سکیں غالب نے اسیری کی بے عزتی سے دل گرفتہ ہوکر ایران مصر اور کعبہ ہی چلے جانے کا نہیں بلکہ دنیا میں نہ رہنے یا صحرا میں نکل جانیکا ارادہ بھی ظاہر کیا ہے جہاں نہ جوا کھیلا جاسکتا تھا اور نہ شراب پی جاسکتی تھی۔ یہ ضرور ہے وہاں غالب کو اپنی بے عزتی کا احساس ہرگز نہ ہوتا جس کے وہ آرزومند تھے۔ خیال یہی ہے کہ غالب نے اسیری کے بعد جوا نہیں کھیلا ہاں! شراب نہ چھوٹ سکی جس کا احساس تمام عمر رہا اور خود کو گناہ گار سمجھا مگر یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ غالب کی شراب نوشی ان کو سوسائٹی سے علیحدہ کر دینے کا سبب بھی بن گئی تھی۔ غالب کے کھانے پینے کے برتن علیحدہ ہو جانا ممکن ہے کیونکہ غالب کی بیوی ایک مذہبی گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں ویسے بھی ہر مذہب کی عورتیں رسم و روایت کی زیادہ ہی پابند ہوتی ہیں میرے خیال میں غالب شراب نہ بھی پیتے تب بھی "انسان دوستی" کی پاداش میں ان کے برتن علیحدہ ہو سکتے تھے کیونکہ غالب کے دوست اور شاگرد نہ صرف مسلمان بلکہ ہندو سکھ اور انگریز بھی تھے اور غالب ان کی خاطر تواضع بھی حسب توفیق کیا کرتے تھے۔

کسی فنکار پر تنقید کرتے وقت یہ بات بھی نظر میں رہنا ضروری ہے۔ کہ اس کو اسی ماحول اور سماج میں رکھکر ناقدانہ نگاہ دوڑائی جائے جس میں اس نے اپنی زندگی گزاری اور جذبہ و فکر کا تانا بانا ترتیب دیا ہے۔ کیونکہ معاشرہ کی بعض اقدار ایسی بھی ہوتی ہیں جن میں ردو بدل ہوتا رہتا ہے۔ کچھ

ل جہان غالب صفحہ ۵۷

باتیں ایک وقت معاشرہ میں بری نہیں سمجھی جاتیں وہی کچھ عرصہ بعد معیوب اور قابل اعتراض سمجھی جانے لگ جاتی ہیں پھر کسی خاص موقعہ اور وقت پر سمجھانے بجھانے کی خاطر کسی کو وقتی طور پر کچھ کہدیا جائے تو وہ فنکار کا نظریہ یا ضابطہ زندگی نہیں ہوتا اس کا مقصد صرف اسی قدر ہوتا ہے کہ وقتی پریشانی اور ناگہانی مصیبت میں کچھ اپنے اور کچھ پرائے غم گنوانے سے ایک شخص میں صدمہ کو برداشت کرنے کی قوت پیدا کی جائے۔ صاحب تصنیف غالب کی حسن پرستی کا تذکرہ کرتے ہوئے ایک جگہ فرماتے ہیں۔

۱ :۔ غالب کو سب سے زیادہ دلچسپی اور شیفتگی نسائی حسن سے ہے [۱]

۱ :۔ وہ عورت کے حسن کو مصری کی ڈلی ہی سمجھتے تھے اور بھنورے کی مانند ہر کلی کی مٹھاس سے لذت آشنا ہونے کی امنگ کرتے ہیں اسی "ہر جائی پن" کو انہوں نے اپنی حسن پرستی کا معیار بنالیا تھا۔" [۲]

دوسری جگہ غالب کا خانگی زندگی کے باب میں تحریر فرمایا ہے۔

۲ :۔ اسی کے ساتھ حسن پرست بھی تھے اور حسن پرستی میں ہوس کا رنگ بھی غالب تھا۔ وہ ایک محبوب کی زلف گرہ گیر میں اسیر رہنا پسند نہیں کرتے تھے بلکہ اپنا مرکز بدلتے رہتے تھے اور یہ تبدیلی ان کے ضابطہ رومان کی حیثیت رکھتی تھی۔" [۳]

تیسری جگہ امراؤ بیگم کی وفات پر تحریر فرماتے ہیں ــــــ۔

۳ :۔ ٹھیک ایک برس بعد قمری مہینے کی اسی تاریخ کو جس کو ان کے شوہر کا انتقال ہوا تھا امراؤ بیگم اس دنیا سے رخصت ہوگئیں اور اس طرح انہوں نے اپنے "عشق پیشہ" شوہر سے وفاداری کا پورا ثبوت دیا"

اس میں شک نہیں کہ غالب حسن پرست تھے۔ انہیں جہاں اور جس صورت میں حسن کے جلوے نظر آتے تھے۔ وہ اسکی تعریف و توصیف ضرور کرتے تھے۔ ان کے شعر و ادب میں مظاہر فطرت اور قدرتی مناظر کی خوبصورتی اور دلکشی کے ساتھ ساتھ نسائی حسن کی رعنائی اور شیفتگی کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔ وہ کلکتہ میں خوبان کشور لندن کے حسن سے بھی متاثر ہوئے اور بنارس کی "قیامت قامتان مژگاں دراز اں" صنم آشنا حسیناؤں کے جمال و رعنائی سے بھی وہ مردانہ حسن کی بھی تعریف کئے بغیر نہ رہتے تھے خود اپنے رنگ و روپ کے بارے میں مرزا حاتم علی بیگ کو لکھا ہے۔ [۴]

"میرا رنگ چمپئی تھا اور دیدہ ور لوگ اس کی ستائش کیا کرتے تھے۔ اب جو کبھی مجھ کو اپنا وہ رنگ یاد آتا ہے تو چھاتی پر سانپ پھر جاتے ہیں۔"

لیکن بھنورے کی مانند ہر کلی کے مٹھاس سے لذت آشنا ہونے کے طور طریق نظر نہیں آتے غالب کی زندگی میں ایک واقعہ ایسا ضرور ملتا ہے۔ جس سے صاحب تصنیف نے مختلف تعبیریں

---

[۱] جہان غالب صفحہ ۶۲ [۲] جہان غالب ۶۳ [۳] جہان غالب ص ۱۰۵ [۴] جہان غالب ص ۱۰۳

اور تغیر یس وضع فرمائی ہیں مگر اس واقعہ پر غور کیا جائے تو اس میں بھی تسکین جذبات سے زیادہ اس عہد کے امیر زادوں کی، ایک غلط روش کی تقلید نظر آتی ہے۔ اب سے تقریباً چالیس پچاس برس پہلے تک امیروں، تعلقداروں اور رؤسا کا کسی طوائف کو بطور داشتہ رکھنا امارت کی دلیل سمجھی جاتی تھی۔ بلکہ جس قدر ایک شخص مالدار ہوتا تھا۔ وہ نہ صرف ایک بلکہ کئی داشتائیں بیک وقت رکھتا تھا۔ مجلسی ادب و آداب سیکھنے کی خاطر رؤسا کے بچوں کا طوائفوں کے گھر جانا بھی اس وقت کی سوسائٹی میں معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا۔ غالب کا بچپن بھی امیر زادوں کی طرح بسر ہوا تھا اور اس ماحول کی کئی برائیاں اُن کی جوانی کا حصہ بن گئی تھیں جن میں سے کئی وقت کے مدوجزر اور شعور کی پختگی کے ساتھ ساتھ ختم ہو گئیں ــــ ستم پیشہ ڈومنی سے محبت کرنے کا تذکرہ غالب نے خود کیا ہے۔ اور اس کی موت پر جو درد و کرب اور رنج و غم ان کے ایک مرثیہ سے عیاں ہے اس کی مثال بھی اردو شاعری میں کم ہی ملتی ہے۔ غالب نے مرزا حاتم علی بیگ مہر کو ایک خط میں مصری کی مکھی بننے اور اپنی جوانی میں ڈومنی کو مار رکھنے کا تذکرہ محض مہر کے شدید غم کو کم کرنے کیلئے کیا گیا ہے۔ اور انداز تحریر وقت کی نزاکت کو ذہن میں رکھتے ہوئے نہایت شوخ، دلچسپ اور موثر اختیار کیا گیا ہے ان تحریروں میں جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں۔ نہ غالب نے اپنا ضابطہ رومان پیش کیا ہے۔ اور نہ اُن سے "یونانی بلکہ سنگدلی کی بو آتی ہے"[1]۔ مار رکھنے "کے لفظ سے یہ بو اسی وقت آ سکتی تھی جب غالب اپنی محبوبہ کو اپنے کسی فعل و عمل سے دیدہ دانستہ خود مار ڈالتے لیکن ایسی نہ حقیقت ہے۔ اور نہ مار رکھنے کے لفظ کا وہ مطلب جو صاحب تصنیف نے لیا ہے۔ غالب "عشق پیشہ" یا بالفاظ دیگر عیاش طبع بھی نہیں کہے جا سکتے۔ ان کا غم بھی عشقیہ واردات کا نہیں بلکہ سماجی نا آسودگیوں کا نتیجہ تھا۔ بقول پروفیسر رشید احمد "غالب کے غم کو محترم یا محترمہ کا کہنا مشکل ہے۔ ان کا غم کمائی گے کیا کا غم ہے۔" خود صاحب تصنیف اسی اظہار رائے کے باوجود کہ غالب ایک محبوب کی زلف گرہ گیر میں اسیر رہنا پسند نہیں کرتے تھے۔ بلکہ اپنا مرکز بدلتے رہتے تھے یہ تحریر کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔

"غالب کے کلام میں عورت سے تنفر کا رجحان ملتا ہے بہت ممکن ہے یہ ان کی خانگی زندگی کی تلخی و ناکامی کے باعث پیدا ہوا ہو۔"

اور اس رائے کی تائید میں صاحب تصنیف نے غالب کے فارسی کلام سے کئی اشعار پیش کئے ہیں۔ یہاں یہ بات بھی ذہن میں ابھرتی ہے کہ غالب کا بیشتر فارسی کلام اُن کے عہد جوانی سے تعلق

---

[1] جہان غالب ص ۶۲

باتیں ایک وقت معاشرہ میں بری نہیں سمجھی جاتیں وہی کچھ عرصہ بعد معیوب اور قابل اعتراض سمجھی جانے لگ جاتی ہیں پھر کسی خاص موقعہ اور وقت پر سمجھانے بجھانے کی خاطر کسی کو وقتی طور پر کچھ کہدیا جائے تو وہ فنکار کا نظریہ یا ضابطہ زندگی نہیں ہوتا اس کا مقصد صرف اسی قدر ہوتا ہے کہ وقتی پریشانی اور ناگہانی مصیبت میں کچھ اپنے اور کچھ پرائے غم گنوانے سے ایک شخص میں صدمہ کو برداشت کرنے کی قوت پیدا کی جائے۔ صاحب تصنیف غالب کی حسن پرستی کا تذکرہ کرتے ہوئے ایک جگہ فرماتے ہیں۔

۱:۔ غالب کو سب سے زیادہ دلچسپی اور شیفتگی نسائی حسن سے ہے۔[۱]

۱:۔ وہ عورت کے حسن کو مصری کی ڈلی ہی سمجھتے تھے اور بھنورے کی مانند ہر کلی کی مٹھاس سے لذت آشنا ہونے کی امنگ کرتے ہیں۔ اسی "ہرجائی پن" کو انہوں نے اپنی حسن پرستی کا معیار بنالیا تھا۔"[۲]

دوسری جگہ غالب کی خانگی زندگی کے باب میں تحریر فرمایا ہے۔

۲:۔ اسی کے ساتھ حسن پرست بھی تھے اور حسن پرستی میں ہوس کا رنگ بھی غالب تھا۔ وہ ایک محبوب کی زلف گرہ گیر میں اسیر رہنا پسند نہیں کرتے تھے بلکہ اپنا مرکز بدلتے رہتے تھے اور یہ تبدیلی ان کے ضابطہ رومان کی حیثیت رکھتی تھی۔"[۳]

تیسری جگہ امراؤ بیگم کی وفات پر تحریر فرماتے ہیں۔۔۔۔

۳:۔ ٹھیک ایک برس بعد قمری مہینے کی اسی تاریخ کو جس کو ان کے شوہر کا انتقال ہوا تھا امراؤ بیگم اس دنیا سے رخصت ہوگئیں اور اس طرح انہوں نے اپنے "عشق پیشہ" شوہر ے دنیاداری کا پورا ثبوت دیا۔"

اس میں شک نہیں کہ غالب حسن پرست تھے۔ انہیں جہاں اور جس صورت میں حسن کے جلوے نظر آتے تھے۔ وہ اسکی تعریف و توصیف ضرور کرتے تھے۔ ان کے شعر و ادب میں مناظر فطرت اور قدرتی مناظر کی خوبصورتی اور دلکشی کے ساتھ ساتھ نسائی حسن کی رعنائی اور شیفتگی کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔ وہ کلکتہ میں خوبان کشور لندن کے حسن سے بھی متاثر ہوئے اور بنارس کی "قیامت قامتان مژگاں درازاں" صنم آشنا حسینوں کے جمال و رعنائی سے بھی وہ مردانہ حسن کی بھی تعریف کئے بغیر نہ رہتے تھے خود اپنے رنگ وروپ کے بارے میں مرزا حاتم علی بیگ کو لکھا ہے۔[۴]

"میرا رنگ چمپئی تھا اور دیدہ ور لوگ اس کی ستائش کیا کرتے تھے۔ اب جو کبھی مجھ کو اپنا وہ رنگ یاد آتا ہے تو چھاتی پر سانپ پھر جاتے ہیں۔"

لیکن بھنورے کی مانند ہر کلی کے مٹھاس سے لذت آشنا ہوتے کے طور طریق نظر نہیں آتے غالب کی زندگی میں ایک واقعہ ایسا ضرور ملتا ہے۔ جس سے صاحب تصنیف نے مختلف تعبیریں

---

[۱] جہان غالب صفحہ ۶۴ [۲] جہان غالب ۶۳ [۳] جہان غالب صہ ۱۰۵ [۴] جہان غالب صہ ۱۰۳

اور تغیر بس و منع فرمائی ہیں مگر اس واقعہ پر غور کیا جائے تو اس میں بھی تسکین جذبات سے زیادہ اس عہد کے امیر زادوں کی، ایک غلط روش کی تقلید نظر آتی ہے۔ اب سے تقریباً چالیس پچاس برس پہلے تک امیروں، تعلقداروں اور رؤسا کا کسی طوائف کو بطور داشتہ رکھنا امارت کی دلیل سمجھی جاتی تھی۔ بلکہ جس قدر ایک شخص مالدار ہوتا تھا۔ وہ نہ صرف ایک بلکہ کئی داشتائیں بیک وقت رکھتا تھا۔ مجلسی ادب و آداب سیکھنے کی خاطر رؤسا کے بچوں کا طوائفوں کے گھر جانا بھی اس وقت کی سوسائٹی میں معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا۔ غالب کا بچپن بھی امیر زادوں کی طرح بسر ہوا تھا اور اس ماحول کی کئی برائیاں اُن کی جوانی کا حصہ بن گئی تھیں جن میں سے کئی وقت کے مدّ و جزر اور شعور کی پختگی کے ساتھ ساتھ ختم ہوگئیں ـــــ ستم پیشہ ڈومنی سے محبت کرنے کا تذکرہ غالب نے خود کیا ہے۔ اور اس کی موت پر جو درد و کرب اور رنج و غم ان کے ایک مرثیہ سے عیاں ہے اس کی مثال بھی اردو شاعری میں کم ہی ملتی ہے۔ غالب نے مرزا حاتم علی بیگ مہر کو ایک خط میں مصری کی مکھی بننے اور اپنی جوانی میں ڈومنی کو مار رکھنے کا تذکرہ محض مہر کے شدید غم کو کم کرنے کیلئے کیا گیا ہے۔ اور انداز تحریر وقت کی نزاکت کو ذہن میں رکھتے ہوئے نہایت شوخ، دلچسپ اور موثر اختیار کیا گیا ہے ان تحریروں میں جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں۔ نہ غالب نے اپنا ضابطہ رومان پیش کیا ہے۔ اور نہ اُن سے "یونانی بلکہ سنگدلی کی بو آتی ہے"[1]۔ مار رکھنے" کے لفظ سے یہ بو اسی وقت آسکتی تھی جب غالب اپنی محبوبہ کو اپنے کسی فعل و عمل سے دیدہ دانستہ خود مار ڈالتے لیکن ایسی نہ حقیقت ہے۔ اور نہ مار رکھنے کے لفظ کا وہ مطلب جو صاحب تصنیف نے لیا ہے۔ غالب "عشق پیشہ" یا بالفاظ دیگر عیاش طبع بھی نہیں کہے جا سکتے۔ ان کا غم بھی عشقیہ واردات کا نہیں بلکہ سماجی ناآسودگیوں کا نتیجہ تھا۔ بقول پروفیسر رشید احمد "غالب کے غم کو محترم یا محترمہ کا کہنا مشکل ہے۔ ان کا غم کھائیں گے کیا کا غم ہے۔" خود صاحب تصنیف اسی اظہار رائے کے باوجود کہ غالب ایک محبوب کی زلف گرہ گیر میں اسیر رہنا پسند نہیں کرتے تھے۔ بلکہ اپنا مرکز بدلتے رہتے تھے یہ تحریر کرنے پر مجبور ہوگئے ہیں۔

"غالب کے کلام میں عورت سے تنفر کا رجحان ملتا ہے بہت ممکن ہے یہ ان کی خانگی زندگی کی تلخی و ناکامی کے باعث پیدا ہوا ہو۔"

اور اس رائے کی تائید میں صاحب تصنیف نے غالب کے فارسی کلام سے کئی اشعار پیش کئے ہیں۔ یہاں یہ بات بھی ذہن میں ابھرتی ہے کہ غالب کا بیشتر فارسی کلام اُن کے عہد جوانی سے تعلق

---

[1] جہان غالب، صـ ۶۳

رکھتا ہے۔ جس سے یہ نتیجہ بھی نکالا جا سکتا ہے۔ کہ غالب کو عہدِ جوانی میں ہی عورت سے نفرت تھی مگر صاحب تصنیف کے دو متضاد نظریات کی روشنی میں قاری کے لئے یہ رائے قائم کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ کہ غالب کو سب سے زیادہ نسائی حسن کا پرستار سمجھا جائے۔ جس میں ہرجائی پن بھی شامل ہے یا عورت بیزار؟ ایک جگہ "غالب کی کمزوریاں" کے باب میں تحریر کیا گیا ہے۔ ۱

"غالب کے اخلاق و مروت کا حلقہ بھی دوستوں ہی تک محدود تھا۔ رشتہ داروں کے معاملہ میں یہ صورت نہ تھی انہوں نے قریب کے عزیزوں کا بھی ساتھ نہیں دیا۔"

اپنی اس رائے کی تاییدو تصدیق میں کوثر چاند پوری نے مرزا غالب کے چھوٹے بھائی مرزا یوسف کے حالات کا تذکرہ بطورِ خاص کیا ہے۔ مگر مجھے واقعات کی روشنی میں صاحب تصنیف کی یہ رائے درست نہیں معلوم ہوتی غالب کے کئی خطوط تحریروں اور خاص طور پر دستنبو سے پتہ چلتا ہے کہ غدر کے زمانے میں مرزا یوسف کی بیوی، لڑکی اور اس کے بچے مرزا یوسف کو دہلی چھوڑ کر جے پور چلے گئے تھے۔ چنانچہ مرزا نے اپنے بھائی یوسف کو اپنے گھر لانے کی پوری کوشش کی مگر نہ لا سکے۔ دوسرے ان کی وفات ۱۹ اکتوبر ۱۸۵۷ء عین زمانۂ غدر میں ہوئی تھی۔ یکا یک افرا تفری، نفسا نفسی اور قتل و غارت کا دور دورہ تھا۔ محلے سونے اور بازار بند تھے کسی کو کسی کی خبر نہ تھی۔ شرفاء اپنی عزت و آبرو کے ڈر سے گوشہ نشینی اختیار کئے ہوئے تھے مبادا کوئی مخبری نہ ہو جائے اور زندگی خطرہ میں پڑ جائے۔ اس خوف اور پریشانی کی وجہ سے غالب کا خود بھائی کے کفن دفن میں شریک نہ ہونا محض مقتضائے وقت تھا۔ مگر اس سے یہ مراد نہیں لی جا سکتی کہ غالب کو بھائی کی موت کا صدمہ نہ تھا۔ یا ان کی لڑکی اور بیوہ کی فکر نہ تھی مرزا یوسف خاں کی ایک ہی لڑکی تھی جس کی شادی غلام فخرالدین سے ہوئی تھی جب تک غلام فخرالدین پر مقدمہ چلتا رہا بڑے مضطرب اور پریشان رہے اور جب وہ بری ہوئے تو بے حد خوش ہوئے غالب کے کوئی اولاد نہ تھی لیکن انہوں نے اپنی بیوی کے بھانجہ عارف کو اپنا بیٹا بنا لیا تھا اور ان سے بے حد محبت کرتے تھے لیکن ان کا بھی عالم جوانی میں انتقال ہو گیا جس پر غالب نے خون کے آنسو روئے جن کی سرنمی درد اور کرب کے ساتھ غالب کی مندرجہ ذیل غزل نما نوحہ کی شکل میں ظاہر ہوئی جس کا پہلا شعر ہے ؎

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستہ کوئی دن اور
تنہا گئے کیوں اب رہو تنہا کوئی دن اور

اس کے علاوہ عارف کے بچوں کی کفالت بھی خود غالب نے کی اور ان سے بے حد محبت کرتے اور ناز اٹھاتے تھے۔ بیوی سے بھی ان کے تعلقات خوشگوار رہے۔ یس ان کے خطوط اور تحریرات میں جہاں جہاں ایسے اشارے ملتے ہیں جس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکے۔ کہ ان کے تعلقات بیوی سے اچھے نہ تھے

---

۱ جہان غالب ص ۲۷

وہ محض غالب کی شوخی طبع اور عبارت آرائی کا ماحصل ہیں، حقیقت ایسی نہ تھی۔ غالب کے تعلقات اپنے برادر نسبتی مرزا علی بخش رنجور اور ہمشیرہ نسبتی بنیادی بیگم سے بھی نہایت شگفتہ اور خوشگوار تھے اسی باب میں ایک جگہ یہ تحریر کیا گیا ہے۔

"غالب بھی جیسا کہ حالات سے معلوم ہوتا ہے انتقام پسند فطرت رکھتے تھے ولیم فریزر کے قتل میں اسی عداوت کی بناء پر انہوں نے نواب شمس الدین احمد خان کی شکایات کیں اور نواب کو پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ اگرچہ شمس الدین احمد خان اس قتل میں شریک تھے۔ مگر غالب کا انتقام کی دوڑ میں اس قدر آگے بڑھ جانا اس نازک مزاجی کے خلاف ہے، جو بحیثیت شاعر کسی شخص کے حصہ میں آتی ہے۔ اچھے شاعر کے پاس ایک اعلیٰ دماغ کے ساتھ ہی ایک بڑا دل بھی ہونا چاہیئے۔ شمس الدین خان کے خون کی سرخی آج بھی ان کے دامن پر موجود ہے ایسی صورت میں غالب کی ان شکوہ طرازیوں میں کوئی وزن نہیں رہتا جو رشتہ داروں کے متعلق ان کے کلام میں پائی جاتی ہیں خود رشتہ دار بھی ان سے اتنے ہی بیزار تھے چنانچہ قید کے دوران میں کوئی رشتہ دار ان سے ملنے نہیں گیا اور خاندان لوہارو نے جو عبرتناک رویہ اختیار کیا وہ پہلے لکھا جا چکا ہے۔"

مذکورہ بالا عبارت کے پڑھنے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے۔ کہ غالب کیونکہ اپنی پنشن والے معاملہ میں نواب شمس الدین احمد خان سے رنجش رکھتے تھے۔ اس لئے ولیم فریزر کے قتل کے موقعہ پر اپنی انتقام پسند فطرت کی خاطر نواب شمس الدین احمد خان کے خلاف شکایات کیں اور انہیں پھانسی پر لٹکوا دیا اور یہی واقعہ غالب کے رشتہ داروں کا ان سے بیزاری کا سبب بنا۔ مجھے صاحب تصنیف کے ان خیالات سے اتفاق نہیں اس واقعہ کے متعلق میں پہلے بھی کسی قدر وضاحت سے تحریر کر چکا ہوں۔ غالب کے خلاف یہ الزام عاید کرنا کہ اس نے نواب شمس الدین کے برخلاف مقدمہ قتل میں ثبوت بہم پہنچایا جو پھانسی کا سبب بن سکا، درست نہیں۔ کیونکہ ہمیں غالب کے خلاف ایسا کوئی ٹھوس مثبت اور قابل یقین ثبوت نہیں ملتا جو انہیں مورد الزام ٹھہرا سکے محض نواب سے رنجش اور ولیم فریزر سے تعلقات غالب کے دامن پر نواب شمس الدین احمد خان کے خون کی سرخی دیکھنے کے لئے ناکافی ہیں

خاندان لوہارو کی بیزاری کا سبب بھی یہی واقعہ پھانسی نہیں ہو سکتا۔ غالب سے زیادہ خود خاندان لوہارو نواب شمس الدین خان سے ناراض تھا آپس کی یہی رنجش قتل ولیم فریزر کی شکل میں ظاہر ہوئی۔ یہی رنجش نواب شمس الدین خان کی پھانسی کا سبب بنی۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ پھر یہی واقعہ خاندان لوہارو اور غالب میں کیونکر سبب بیزاری ہو سکتا تھا۔ یہ درست ہے کہ اس خاندان نے

جہان غالب صـ۱۰۸

غالب کی کوئی اعانت دوران اسیری نہیں کی جس کی شکایت غالب کو بجا طور پر تھی اور یہ غالب کی نہیں بلکہ خاندان لوہارو کی اخلاقی کمزوری تھی۔

محولہ بالا عبارت پڑھنے کے بعد ایک اور تاثر جو قاری کے ذہن میں ابھرتا ہے وہ یہ کہ غالب اعلیٰ دماغ تو رکھتے تھے لیکن اُن کے پاس بڑا دل نہ تھا جس کا ہونا بھی ضروری تھا یہ فیصلہ صاحب تصنیف نے جن وجوہات کی روشنی میں مرتب فرمایا ہے وہ وہی واقعہ پھانسی نواب شمس الدین خان ہے جس میں غالب پر شکایات کرنے کا الزام عاید کیا گیا ہے۔ اول تو صاحب تصنیف خود یہ درست تسلیم کرتے ہیں کہ ولیم فریزر کے قتل میں نواب شمس الدین خان شریک تھے۔ اور ان کے ایماء پر قتل ہوا تھا جس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ نواب شمس الدین کا فیصلہ پھانسی غلط نہ تھا۔ دوسرے اس الزام سے کہ غالب نے شکایات کیں پہلے ہی انکار کیا جا چکا ہے اگر اسے درست تسلیم بھی کر لیا جائے تب بھی کسی حقیقت سے اغماض نہ بڑے دل کے لئے ضروری ہے نہ کسی معاشرے کی اخلاقی اور مذہبی اقدار اس کی اجازت دے سکتی ہیں بڑے دل کا تقاضہ اور مطالبہ تو یہی ہوتا ہے کہ ایک انسان ان تمام حالات کو پس پشت ڈال کر جو حق گوئی اور راستبازی کی راہ میں حائل ہو رہے ہوں بلا تخصیص مذہب و ملت نعرہ حق لگائے تاکہ سچائی، موقعہ اور مصلحت کے وزن تلے دب اور کراہ کر دم نہ توڑ دے اسی راست گوئی اور حقیقت بیانی کو قائم و دائم رکھنے اسے تابندگی اور نکھار بخشنے کی خاطر بارہا صاحبان دل اور راستبازوں نے تختہ دار کو بیک اور تلوار کی دھار کو قبول کیا ہے یہاں اس بات سے قطع نظر کہ غالب کے پاس بڑا دل تھا یا نہیں۔ یا اس کا ہونا ضروری تھا یہ حقیقت مسلّم ہے کہ سچائی سے رو گردانی بڑے دل کی صفت نہ کبھی سمجھی گئی ہے اور نہ سمجھی جا سکتی ہے۔

ایک جگہ تحریر کیا گیا ہے [1]

"خود غرضی اور موقعہ پرستی غالب کی فطرت کا ایک ایسا عنصر تھا جس کا مظاہرہ ہر جگہ ہوتا ہے کہیں کہیں یہ چیز حسد رشک اور رقابت کی شکل میں نمودار ہوتی ہے بعض اوقات وہ انسانیت کی اتنی پست سطح پر آجاتے ہیں جس کے آگے پستی کا کوئی تصور باقی نہیں رہتا۔" [1]

صاحب تصنیف نے اس رائے کی دلیل میں چند ناقدین کی تحریروں کے اقتباسات اور خاص طور پر غالب کے ایک خط کا حوالہ دیا ہے۔ جو مفتی صدرالدین آزردہ کی بیوہ کو مالی امداد مل جانے پر نواب رام پور کو لکھا گیا ہے مجھے صاحب تصنیف کی اس رائے سے اختلاف ہے کہ غالب خود غرض "حاسد" تھے اس میں شک نہیں کہ غالب امیرانہ ماحول کی پیداوار تھے۔ اور بچپن ہی سے اس ماحول کی ایسی عادات و خصائل ان کے مزاج میں رچ بس گئی تھیں جن کا چھوٹنا باوجود معاشی الجھنوں اور مالی بے اطمینانیوں کے مشکل تھا۔ اچھا کھانا

---

[1] جہان غالب ۹۴

کھلانے، شراب پینے اور نوابانہ رہن سہن کے عادی تھے۔ زندگی کی اس امیرانہ ڈھب کو قائم رکھنے کیلئے غالب نے متعدد بنیے ساہوکاروں سے قرض لیا۔ دوستوں اور رشتے داروں کے آگے دست طلب دراز کیا مگر اس کو غالب کی خود غرضی پر محمول نہیں کیا جا سکتا بلکہ مجبوری پر۔ غالب نے اپنے شعر و ادب میں کہیں پیغمبر، ولی، مبلغ یا مصلح قوم ہونے کا دعویٰ بھی نہیں کیا ہے جو اُن کی شخصیت میں فرشتوں جیسی صفات کی جستجو اور تلاش کی جائے۔ غالب خود بھی اپنے متعلق یہی کہتے ہیں۔

خوئے آدم دارم آدم زادہ ام　　آشکارا دم ز عصیاں می زنم

غالب ایک انسان ہیں صرف انسان جو ناساز گار حالات میں پریشان اور خوش کن ماحول میں مسرور ہو جاتے ہیں جنہیں ہمدردی بھی ہے۔ دردمندی بھی اور صلح جوئی کا جذبہ بھی۔ وہ قرض لیتے تھے مگر اسکے ادا کرنے کا خیال بھی رہتا تھا۔ شراب پیتے تھے مگر اپنے اس فعل کو گناہ ہی سمجھتے تھے۔ اور خود کو گنہ گار۔ قصیدے کہتے تھے تاہم مدح سرائی کی ذلت کا احساس تھا اور ہر شخص کے سامنے ہاتھ پھیلانا پسند نہ کرتے تھے اُن میں اپنی شہرت اور قدردانی کا جذبہ بھی تھا اور بے عزتی اور ناقدرشناسی کا احساس بھی اور یہی احساس کبھی کبھی وقتی طور پر انہیں ترک وطن کی ترغیب بھی دیتا نظر آتا ہے۔ حالانکہ وہ وطن دوست تھے۔ اور یہاں کی ہر چیز انہیں ایسی ہی عزیز تھی جیسے اپنی ہو اور ان سب جذبات و احساسات کی سند ہمیں خود غالب کے کلام سے مل جاتی ہے چند اشعار بغرض ملاحظہ پیش ہیں۔

یہ مسائل تصوف یہ ترا بیان غالب　　تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

کعبے کس منہ سے جاؤ گے غالب　　شرم تم کو مگر نہیں آتی

دیوار بار منت مزدور سے ہے خم　　اے خانماں خراب نہ احساں اٹھائیے

بلبل گلشن عشق آمدہ غالب ز ازل　　حیف گر زمزمۂ مدح و ثنا خیزد ازو

بنا سازگاری ز ہمسائیگاں　　بر سرمایہ جوئی ز بے مایگاں

سر از منتِ ناکساں زیر خاک　　لب از خاک بوس چساں چاک چاک

دم از ریاست دہلی نمی زنم غالب　　منم ز خاک نشیناں آں دیار یکے

پھر فن کی تحسین محض فن کی روشنی میں ہی کی جاتی ہے۔ اور کسی شاعر یا ادیب کی زندگی اور ماحول کے اسی قدر گوشوں کی معلومات ضروری ہوتی ہے جس کا عکس براہ راست یا بالواسطہ اس کے فن پر پڑا ہو اس سے زیادہ نہ فن کیلئے ضروری ہوتا ہے۔ اور نہ کسی فنکار کو سمجھنے سمجھانے کے لئے۔ مرزا غالب کے جس خط کا حوالہ دیا گیا ہے۔ اسکی عبارت سے صرف اسی قدر پتہ چلتا ہے کہ غالب نے بیوہ مفتی آزردہ کی امداد کو ایک دلیل بنا کر اس امر کا اظہار کیا ہے۔ کہ ان کے حالات بیوہ آزردہ سے بھی زیادہ سقیم اور ناگفتہ بہ ہیں اسلئے وہ ان سے کہیں زیادہ امداد کے مستحق ہیں خط کی تحریر سے ایسا ترشح نہیں ہوتا کہ بیوہ صدرالدین آزردہ کی امداد کو نامناسب قرار دیا ہو اور اس

اس کا مستحق خود کو گردانا ہو۔

باین ہمہ کوثر چاند پوری نے "جہان غالب" میں جس قدر معلومات غالبؔ کی زندگی اور فن پر مہیا ہو سکتی تھیں بڑی کاوش اور جستجو کے ساتھ فراہم کی ہے۔ اور نہایت صاف ستھرے انداز میں اپنی تنقید کے ساتھ قارئین کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ جس سے ان کے گہرے مطالعے اور باریک بینی کا پتہ چلتا ہے۔ یہ درست ہے کہ کسی فنکار پر تنقید کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہوتا کہ صرف اس کے فن کی تعریف و توصیف کی جائے۔ اور غلطیوں کو نظر انداز کر دیا جائے۔ یا انہیں خوبیاں گنوانے کی کوشش کی جائے۔ غالب کا کلام بھی غلطیوں سے بالکل پاک صاف نہیں ہے۔ یا انہوں نے بھی سارے بلند اشعار نہیں کہے ہیں یا ایسے کہ جن سے زندگی کے ہر گوشہ کی عکاسی ہو گئی ہو البتہ یہ ضرور ہے کہ جو کچھ غالب نے کہا ہے اس میں بیشتر بلند و بالا ہے۔ اور یہ صفت دوسرے شعراء میں کم ہی نظر آتی ہے۔ دوسرے صفت غالب کو دوسرے شعرا کے مقابلے میں عظیم المرتبت بنا دیتی ہے۔ وہ اُن کی فکری تگ و تاز ہے جس سے انہوں نے شعر و ادب کے نقوش کئے ہیں اور اس میں شک نہیں کہ غالب کے بعد کئی ایسے قافلے ان راستوں سے گزرے ہیں جنہوں نے ادب و فن کی خدمت بڑی حد تک وقت کے تقاضوں اور حالات کے مطالبوں کی روشنی میں کی ہے۔

"جہان غالب" چند اختلافات کے باوجود میری نظر میں غالبؔ پر ایک گرانقدر علمی و ادبی سرمایہ ہے۔ جس سے غالب کی ذہنی بالیدگی، فکر، صلاحیت اور شخصیت کے کئی نقوش ابھرے ہیں ساتھ ہی تحقیق و تفتیش کا عزم و حوصلہ بھی پیدا ہوا ہے کوثر چاند پوری خود بھی "جہان غالب" کو حرف آخر کا درجہ نہیں دیتے۔ پیش لفظ میں تحریر کیا ہے۔ؔ

جہانِ غالب تحقیق و تنقید کا ذوق ابھارے گی۔ اور صحتمند اختلاف کے لئے نئے راستوں پر ترغیب دے گی۔" اور یہ حقیقت ہے۔ کہ اس تصنیف نے ارباب نظر کو چونکایا بھی ہے۔ اور دعوت فکر بھی دی ہے۔ جس سے غالب کو سمجھنے سمجھانے میں بڑی مدد ملی ہے۔

ؔ جہان غالب صفحہ ۹